1952

1. Essay — 25
2. Ghazaliat & Masnavi
3. Literary activities of Hali) 25

U1
J1340

زیادہ ہے۔ اور اِس میں اضافہ کرنے کے لئے مزید
کوششیں کی جارہی ہیں۔ گذشتہ سال سنہ ۳۸ء کے
مقابلہ میں ۸ فی صدی برآمد زیادہ ہوئی تھی۔ اور
سنہ ۴۸ء کی پہلی ششماہی میں ۳۰ فی صدی کا اضافہ
ہوا تھا۔ کوشش کی جارہی ہے کہ اِس سال کے
بجٹ میں ۳۹۹،۳۱ کروڑ روپیہ (۳۰۰،۰۰۰،۰۰ پونڈ)

دیوانِ حالی

کُتب خانہ علم و ادب دہلی

دُر مَعَ الدَّہر کَیفَ دَارَ
جس رُخ زمانہ پھرے اُسی رُخ پھر جاؤ

Prof. Jagan Nath Azad,
A-25, Government Quarters,
Gandhi Nagar, Jammu
(J & K)-180004
Phone: 30907

دیوانِ حالی

مصنّفہ

شمس العلما خواجہ الطاف حسین حالی

جس میں
قطعات، غزلیات، قصیدے، مرثیے، ترکیب بند، رباعیاں
اور متفرق اشعار شامل ہیں

کُتب خانہ علم و ادب دہلی

U1
V+139D

ناشر

مطبع علیمی دہلی

Kashmir University
Iqbal Library
Acc. No 503529
Dated 4-4-05

۱۹۴۵ء

قیمت عہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ

یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا
کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذب حق نما ہے

ایک زمانہ تھا کہ شاعری اور عشق یا تعشق کو لازم و ملزوم سمجھتے تھے اور ایسا سمجھنا کچھ بے وجہ نہ تھا۔ اوّل تو خود شعر کا حدوث ہی دنیا میں اُس جوش اور ولولہ سے ہوا ہے جو عشق اور محبت کی بدولت انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے اور شعر کی ذات میں جو ایک آتش گیر مادّہ لیے ہے وہ بھی اپنے مشتعل ہونے میں کسی آگ کی اشتعالک کا محتاج ہے۔ پھر قوم کا کلام بھی جہاں تک دیکھا گیا اُسی خیال کی تائید کرتا تھا۔ بایں ہمہ حداثت سن یہ کب اجازت دیتی تھی کہ شاہدِ رعنائے سخن کا نظارہ ایک پیرزال کی صورت میں کیا جائے اور شراب ارغوانی کی جگہ سرکہ بے نمک سے ضیافتِ طبع کی جائے۔ غرض کہ ایک مدت تک یہ حال رہا کہ عاشقانہ شعر کے سوا کوئی کلام پسند نہ آتا تھا۔ بلکہ جس شعر میں یہ چاشنی نہ ہوتی تھی۔ اُس پر شعر کا اطلاق کرنے میں بھی مضائقہ ہوتا تھا۔ خود بھی جب کبھی یہ سودا اُچھلا آنکھیں بند کیں اور اسی شارع عام پر پڑ لیے جس پر رہ گیروں کا تانتا بندھا ہوا تھا قافلہ کا

۱؎ قوم سے یہاں اُس کے متعارف معنی مراد نہیں ہیں۔ بلکہ یہاں قوم سے مراد شعرا ہیں

ساتھ۔ راہ کی ہمواری اور رہ گذر کی فضا چھوڑ کر دوسرا رستہ اختیار کرنے کا کبھی خیال بھی نہ آیا۔ مگر جب آفتابِ عمر نے پلٹا کھایا اور دن ڈھلنا شروع ہُوا وہ تمام سیمیائی جلوے جو خوابِ غفلت میں حقائق سے زیادہ دل فریب نظر آتے تھے رفتہ رفتہ کافور ہونے لگے۔ غزل و تشبیب کی اُمنگ انفعال کے ساتھ بدل گئی۔ اور جس شاعری پر ناز تھا اُس سے شرم آنے لگی۔ ہر چند سمجھایا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب آئے ہیں۔ مگر یہی جواب دیا گیا کہ غزل کہنے کے دن اب گئے۔

یقولون[ف۱] ھل قبل الثلثین ملعب
فقلت وھل بعد الثلثین ملعب

جو لوگ عاشقانہ گوئی کے چٹخارے سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ یہ خون جہاں مُنہ کو لگا۔ پھر ذرا مشکل سے چھوٹتا ہے۔ مگر زمانہ کی ضرورتوں نے یہ سبق پڑھایا کہ دل فریب مگر نکمّی باتوں پر آفریں سننے سے دل شکن مگر کام کی باتوں پر نفریں سننی بہتر ہے اور حاکمِ وقت نے یہ حکم دیا کہ پروانہ بلبل کی قسمت کو تو بہت رو چکے۔ کبھی اپنے حال پر بھی دو آنسو بہانے ضرور ہیں۔

یکرہ بحالِ خویش ہم آخر تواں گریست
تا چند بر فلاں و بہماں[ف۲] گریستن

کچھ نظمیں قوم کی حالت پر لکھی گئیں۔ بعضوں نے پسند کیں اور بعضوں نے ناپسند، مگر چوٹ سب کے دل پر لگی۔ کہانی بے مزہ تھی مگر آپ بیتی، اور باتیں اوپری تھیں مگر پتے کی جو نظمیں کسی قدر طولانی تھیں وہ تقریباً تمام چھپ چکی اور شائع ہو چکی ہیں۔ اب زیادہ تر

[ف۱] یعنی لوگ کہتے ہیں کہ کیا لہو و لعب کا زمانہ تیس برس سے پہلے ہے؟ سو میں نے اُن سے کہا کیا لہو و لعب کا زمانہ تیس برس کے بعد ہے؟ ۱۲

[ف۲] ب ہ م ا ں بمعنی فلاں شخص - ۱۲

کچھ بچے کھچے متفرق اور پراگندہ خیالات باقی ہیں۔ جن میں سے کسی قدر قطعہ و رباعی کے لباس میں اور کچھ غزل کے روپ میں ظاہر کیے گئے ہیں۔ ان کے سوا چند ترکیب بند ایک آدھ مسمّط۔ کچھ قصیدے اور کچھ تاریخیں ہیں۔ جن میں سے اکثر خاص خاص طور پر وقتاً بعد وقتٍ شائع ہو چکی ہیں لیکن مصنف کی طرف سے عام طور پر پبلک کی نذر نہیں ہوئیں۔ پہلا کلام جو عالم جہل و نادانی یا خلاصہ زندگانی کی نشانی ہے وہ بھی کسی قدر تلف ہو جانے کے بعد جس قدر بچا ہے اب تک محفوظ ہے۔ انسان کی طبیعت کا مقتضیٰ ہے کہ جو کام اُس کی تھوڑی یا بہت کوشش سے سر انجام ہوتا ہے۔ عام اِس سے کہ اچھا ہو یا برا اور پسند کے لائق ہو یا نہ ہو وہ اس کو بڑے فخر کے ساتھ پبلک میں پیش کرنے کی جرأت کرتا ہے اور خاص و عام سے اپنی کوشش کی داد چاہتا ہے جس فخر کے ساتھ کہ وہ اعرابی[1] جس نے کبھی آب شیریں کا مزہ نہ چکھا تھا ایک کھاری پانی کے چشمہ سے مشک بھر کر ہارون رشید کے دربار میں بطور سوغات کے لے گیا تھا۔ وہ اس فخر سے کچھ کم نہ تھا جو کلمبس امریکہ دریافت کر کے ازبلا کے دربار میں اپنے ساتھ لایا تھا۔

---

[1] یہ ایک مشہور حکایت کی طرف اشارہ ہے یعنی ہارون رشید کے زمانہ میں ایک بدوی جس نے کبھی دجلہ کے شیریں پانی کا مزہ نہ چکھا تھا۔ اُس کو صحرا میں ایک چشمہ ملا جس کا پانی اگرچہ دجلہ کے پانی سے کچھ نسبت نہ رکھتا تھا لیکن جیسا شور پانی کہ وہ بدوی ہمیشہ پیا کرتا تھا اس سے کسی قدر میٹھا تھا۔ وہ خوشی خوشی اس کی ایک مشک بھر کر بغداد پہنچا اور خلیفہ کے دربار میں اُس کو بطور ایک علق نفیس کے پیش کیا۔ خلیفہ نے اُس کو چکھا تو بالکل کھاری پانی تھا۔ مگر اس کی بدمزگی بدوی پر ظاہر نہیں ہونے دی اور اس کو انعام دے کر رخصت کیا اور حکم دیا کہ یہ شخص دجلہ کا پانی نہ پینے پائے ورنہ اپنے دل میں شرمندہ ہوگا۔ ۱۲

پس یہ تمام مجموعہ جس میں کچھ نئے اور کچھ پرانے خیالات شامل ہیں محض ایک اُمید موہوم پر کہ دیکھیے مردود ہو یا مقبول ملک کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔ اور پہلے اس سے کہ کوئی ہم پر ہنسے ہم اپنے دعووں پر آپ ہنستے ہیں۔

شاید ناظرین کو پچھلے زمانہ کے خیالات میں پہلے زمانہ کی نسبت حقائق و واقعات کا کچھ زیادہ جلوہ نظر آئے اور جیسی کہ اُمید کی جاتی ہے ان خیالات کو سچی شاعری کا ایک نمونہ تصور کیا جائے مگر یہ بات کہ جیسے خیالات کانوں کو سچے معلوم ہوتے ہیں۔ ایسے سچے دل سے بھی نکلتے ہیں یا نہیں خود ہم کو بھی معلوم نہیں۔ تا بدیگراں چہ رسد۔ جیسا کام محض سچے جوش اور ولولہ سے ہوتا ہے۔ ویسا ہی بلکہ بعض اوقات اس سے بہتر محض شہرت اور نام وری کی خواہش۔ تحسین و آفرین کے لالچ۔ جلب منفعت کی توقع یا کم سے کم اپنا دل خوش کرنے کے خیال سے بھی ہو سکتا ہے۔ اور خود کرنے والے کو اپنے کام کا منشاء معلوم نہیں ہوتا۔ لیکن اگرچہ ہم اس وقت نہ ہوں گے مگر زمانہ سچ اور جھوٹ کو اور دودھ اور پانی کو الگ کیے بغیر نہ رہیگا۔ سچ پھولے گا اور پھلے گا اور جھوٹ برسات کے سبزہ کی طرح جلد نیست و نابود ہو جائیگا۔

[1] وکم قد رأینا من فروعٍ کثیرۃٍ
تموت۔ اذا لم یحیہنّ اصولُ

ناظرین کو معلوم رہے کہ جب کسی ملک یا قوم یا شخص کے خیالات بدلتے ہیں تو خیالات کے ساتھ طرز بیان نہیں بدلتی۔ گاڑی کی رفتار میں فرق آ جاتا ہے۔ مگر پہیا اور دھرا بدستور باقی رہتا ہے۔ اسلام نے جاہلیت کے خیالات بہت کچھ بدل دیئے تھے مگر اسلوبِ

---

[1] ہم نے وہ شاخیں اکثر سوکھتی دیکھی ہیں جن کی جڑیں اس قابل نہ تھیں کہ اپنی شاخوں کو سرسبز رکھ سکیں۔

بیان میں مطلق فرق نہیں آیا۔ جو تشبیہیں اور استعارے پہلے مدح۔ ہجا۔ غزل اور تشبیب میں برتے جاتے تھے۔ وہی اب توحید مناجات اخلاق اور موعظت میں استعمال ہونے لگے۔ خاص کر شعر میں اس بات کی اور بھی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ممکن ہے کہ متاخرین قدیم شعرا کے بعض خیالات کی پیروی سے دست بردار ہو جائیں گے مگر اُن کے طریقہ بیان سے دست بردار نہیں ہو سکتے۔ جس طرح کسی غیر ملک میں نئے وارد ہونے والے سیاح کو اس بات کی ضرورت ہے کہ ملک میں روشناس ہونے اور اہلِ ملک کے دل میں جگہ کرنے کے لئے اسی ملک کی زبان میں گفتگو کرنی سیکھے۔ اور اپنی وضع صورت اور لباس کی اجنبیت کو زبان کے اتحاد سے بالکل زائل کر دے۔ اسی طرح نئے خیالات کے شاعر کو بھی سخت ضرورت ہے کہ طرزِ بیان میں قدما کی طرزِ بیان سے بہت دور نہ جا پڑے اور جہاں تک ممکن ہو اپنے خیالات کو اُنھیں پیرایوں میں ادا کرے جن سے لوگوں کے کان مانوس ہوں اور قدما کا دل سے شکر گزار ہو جو اس کے لیے ایسے منجھے ہوئے الفاظ و محاورات و تشبیہات و استعارات وغیرہ کا ذخیرہ چھوڑ گئے۔

کچھ تعجب نہیں کہ اس مجموعہ کو اور نیز اُن نظموں کو جو پہلے شائع ہو چکی ہیں دیکھ کر یہ خیال پیدا ہوا کہ ان میں نئی بات کونسی ہے؟ نہ خیالات ہی ایسے اچھوتے ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں اور نہ طرزِ بیان ہی میں کوئی جدت ہے جس سے کبھی کان آشنا نہ ہوئے ہوں اور یہ سمجھ کر وہ بے اختیار پکار اُٹھیں کہ "ھٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ"[1]

---

[1] قرآن مجید میں مذکور ہے کہ جب اہلِ جنت کو کوئی جنت کا پھل کھانے کو دیا جائیگا تو وہ کہیں گے ھذا الذی رزقنا من قبل (یعنی یہ تو وہی ہے جو ہم کو پہلے دیا گیا تھا) کیونکہ جنت کے میوے صورت میں یکساں معلوم ہوں گے۔ مگر ہر ایک کا مزہ اور لذت جُدا ہوگی۔ ۱۲

پس ان کی خدمت میں عرض کیا جاتا ہے کہ بیشک طرزِ ادا میں جیسا کہ ابھی بیان ہو چکا وہ بہت کم فرق پائیں گے۔ مگر خیالات میں ذرا بھی غور فرمائیں گے تو ان کو ایک دوسرا عالم نظر آئے گا وہ دیکھیں گے کہ محل نہیں بدلے مگر محل نشیں بدل گئے ہیں۔ اور گو پیالے وہی ہیں مگر شراب اور ہے۔

نئے خیالات سے ایسے خیالات ہرگز مراد نہیں ہیں جو کسی کے ذہن میں نہ گزرے ہوں یا کسی کے ذہن کی اُن تک رسائی نہ ہو سکے بلکہ ایسے خیالات مُراد ہیں جو شاعر و ناشاعر کے دل میں ہمیشہ گزرتے ہیں اور ہر وقت اُن کے پیشِ نظر ہیں مگر اس وجہ سے کہ وہ ایسے پامال اور مُبتذل ہیں اُن کو حقیر سمجھ کر چھوڑ دیا گیا اور اُن کی طرف بہت کم التفات کیا گیا اور پایہ شاعری کو اُن سے ورا الورا سمجھا گیا ہے۔ لیکن فی الحقیقت شاعری کا بھید اُنھیں مبتذل خیالات میں چھپا ہوا تھا جو بہ سبب غایت ظہور کے لوگوں کی نظر سے مخفی تھا۔

دیکھ اے بُلبل ذرا گُلبن کو آنکھیں کھول کر
پھول میں گر آن ہی کانٹے میں بھی اِک شان ہے

انسان میں جیسا کہ ظاہر ہے ہرگز یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ کسی چیز کو عدمِ محض سے وجود میں لا سکے۔ اس کی بڑی دوڑ یہی ہے کہ وہ موجودات میں سے چند چیزوں کو ترکیب دے کر اُس میں ایک نئی صورت پیدا کر دے۔ پس جس طرح معمار عمارت تیار کرنے میں اینٹ مٹی اور چونے کا یا بڑھئی ایک تخت کے بنانے میں لکڑی اور لوہے کا محتاج ہے۔ اسی طرح ضرور ہے کہ شاعر بھی کسی شعر کو ترتیب دینے میں کسی ایسے مصالح کا محتاج ہو جو اینٹ اور مٹی یا لکڑی اور لوہے کی طرح نفس الامر میں موجود ہو۔ وہ مصالح کیا ہے؟ یہی دنیا کے حالات جو روزمرہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتے ہیں۔ خواہ وہ انسان

سے علاقہ رکھتے ہوں یا زمین - آسمان - چاند - سورج - پہاڑ اور دریا جیسی شاندار چیزوں سے یا مچھر - مکڑی اور جھینگے جیسی بے حقیقت چیزوں سے پس شاعر نے ان حالات کو معمولی باتیں سمجھ کر چھوڑ دیا اور شعر کی بنیاد محض فرضی اور ناممکن باتوں پر رکھنی چاہی - اس کی مثال اس معمار کی سی ہوگی جو عمارت بنانے کے لئے اینٹ اور مٹی کی کچھ ضرورت نہیں سمجھتا بلکہ ایسے مصالح کی ضرورت سمجھتا ہے جس سے عمارت تیار نہیں ہو سکتی -

ترسم نہ رسی بہ کعبہ اے اعرابی
کایں رہ کہ تو میروی بہ ترکستان است

الغرض جب سے شاعری کی نے کُھلی معمولی شکار چھوڑ کر عنقا کی گھات میں بیٹھنا اور زمین پر ساگ پات کے ہوتے آسمان سے نزولِ مائدہ کا انتظار کرنا چھوڑ دیا زمانہ کے حالات کو دیکھ کر جو کیفیتیں نفس پر طاری ہوتی رہیں اور جن واقعات کے سننے سے دل پر چوٹ لگتی رہی اُن کو وقتاً فوقتاً اپنے سلیقہ کے موافق شعر کا لباس پہناتے رہے بعض خیالات بحسبِ ضرورتِ وقت اقوالِ سلف یا حکایاتِ سلف سے اخذ کیے گئے۔ کہیں اُن کو اپنے حال پر رہنے دیا اور کہیں اپنی طرف سے کچھ اضافہ کر کے اُس کو ایک نئی صورت میں جلوہ گر کیا گیا۔ بعض قطعات و رباعیات میں اخلاقی مضامین کنایہ میں ادا کیے گئے - جو شاید کہیں کہیں مطائبہ کی حد کو پہنچ گئے ہوں - مگر انوری و سعدی و شفائی کے مطائبات کے آگے یقیناً بے نمک معلوم ہوں گے - ریا و مکر و سالوس و عجب و خود پسندی اور اسی قسم کے اخلاق واعظ و زاہد و صوفی و شیخ و مُلّا پر ڈھالے گئے نہ اس لیے کہ نعوذ باللہ اس فرقہ علیہ کی مذمت مقصود تھی - بلکہ اس لیے کہ ان اخلاق کے بیان کرنے کا اس سے واضح تر کوئی عنوان نہ تھا - سیاہی کا دھبّا جیسا اُجلے کپڑے پر صاف نمایاں ہوتا ہے - ایسا میلے کپڑے پر

نہیں ہوتا ظلم اور بے انصافی کے مرتکب اپنی اپنی طاقت کے موافق فقیر اور بادشاہ دونوں ہوتے ہیں۔ مگر جب ظلم کو زیادہ ہولناک صورت میں دکھانا منظور ہوتا ہے تو وہ ہمیشہ سلطنت کے لباس میں ظاہر کیا جاتا ہے اسی طرح ریا و عجب و خود پسندی اگرچہ ہر فرد بشر میں کم و بیش پائی جاتی ہے مگر جب اس کو علم و زہد و مشیخت کی طرف منسوب کیا جاتا ہے تو وہ زیادہ تعجب انگیز اور ڈراونی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور یہی شاعری کی علتِ غائی ہے۔

شاعر جب اخلاقی مضامین بیان کرتا ہے تو اُس کو بہ ضرورت اکثر نصیحت و پند کا پیرایہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے ہم کو بھی کہیں کہیں ناصح بننا پڑا ہے۔ مگر اصلی ناصح کی نصیحت اور شاعر کے ناصحانہ بیان میں بہت بڑا فرق ہے۔ اصلی ناصح خود برائیوں سے پاک ہو کر اوروں کو ان سے باز رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ مگر شاعر چوں کہ برائیوں کی ہو بہو تصویر کھینچ کر دکھاتا ہے اور گھر کے بھیدی کی طرح چھپے رستموں کے پتّرے کھولتا ہے۔ اس لیے سمجھنا چاہیے کہ وہ زیادہ تر اپنے ہی عیب اوروں پر دھر کر ظاہر کرتا ہے۔ ہر بدی اور گناہ کا نمونہ کم یا زیادہ پوشیدہ یا علانیہ انسان کے نفس میں موجود ہے پس اگر بدی یا گناہ کے متعلق کوئی پتے کی بات شاعر کے قلم سے مترشح ہو تو جاننا چاہیے کہ وہ اپنے نفس ہی کی چوریاں ظاہر کر رہا ہے۔

ہیں عاشقی کی گھاتیں معلوم اُس کو ساری حالؔی سے بدگمانی بے جا نہیں ہماری

شاید اس موقع پر شاعر کی طرف سے یہ عذر ہو سکے کہ اس میں فطرتِ انسانی کے دقائق و غوامض سمجھنے کا ایک خداداد ملکہ ہوتا ہے جس کی مدد سے بعض اوقات ایک رند مشرب اور خراباتی شاعر جس پر پرہیزگاری کی کبھی چھینٹ نہ پڑی ہو وہ

پرہیزگاروں کی سوسائٹی کا ایسا صحیح نقشہ کھینچ دیتا ہے کہ خود اُس سوسائٹی کے ممبر بھی اپنی سوسائٹی کا ویسا نقشہ نہیں کھینچ سکتے۔ اسی طرح ایک دوسرا شاعر جس نے پرہیزگاروں اور پارساؤں کے حلقہ سے کبھی قدم باہر نہیں رکھا وہ رندو اوباش کی صحبتوں کا ایسا چربا اُتار دیتا ہے کہ گویا اُنھیں میں سے ایک نے اپنی حالت کی تصویر کھینچی ہے ابونواس نے بارہا خلیفہ سے ایک مصرع کی تضمین میں ایسے واقعات بیان کردیے ہیں کہ خلیفہ متعجب ہوکر بے ساختہ یہ کہہ اُٹھتا تھا۔ قاتلک[لہ] اللہ کانک کنت ثالثنا شکسپیر جس کے ہمراہی ہرن کا شکار کھیلنے والے اور تماشا کرنے والے تھے اور جس نے کبھی آنکھ کھول کر عالی خاندان اور شریف و پاکیزہ عورتوں کی سوسائٹی نہ دیکھی تھی اس نے میکبث، جولیٹ، کیتھرائن، ڈزڈمونا اور بعض لیڈیوں کے ایسے اصلی کیریکٹر دکھائے ہیں جن کا اس سوسائٹی پر جس میں اُس کی عمر گزری تھی کبھی پرچھاواں تک نہ پڑا تھا۔ ایران میں فردوسی اور ہندوستان میں انیس رزم کے بیان میں صدہا باتیں ایسی ٹھکانے کی لکھ جاتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعات گویا خود اُن پر گزرے تھے۔

اس عذر سے اگرچہ کسی قدر شاعر کی برأت ہو سکتی ہے۔ مگر پھر بھی اُس کو واعظ و ناصح کا درجہ نہیں دیا جاسکتا۔ ناصح کی غرض براہ راست ارشاد و ہدایت ہوتی ہے بہ خلاف شاعر کے کہ اس کا اصل مقصود فطرت انسانی کی کُرید اور واقعات دہر سے متاثر ہو کر دل کی بھڑاس نکالنی ہے اور بس، وہ کسی کے سمجھانے کے لیے

[لہ] ترجمہ خدا تجکو شرمائے گویا کہ تیسرا ہم میں تو تھا یعنی تو نے ایسے صحیح واقعات بیان کئے ہیں کہ گویا تو بھی ہماری صحبت میں شریک تھا۔ ۱۲

نہیں چلاتا بلکہ خود کچھ سمجھ کر چیخ اُٹھتا ہے۔

ناصح مشفق ہیں یاروں کے نہ مصلح اور مشیر — دردمند ان کے نہ اُن کے درد کے درماں ہیں ہم
پھوٹ پڑتے ہیں تماشا اس چمن کا دیکھ کر — نالۂ بے اختیارِ بلبلِ نالاں ہیں ہم

پس اگر شاعر کا کوئی قول اس کے فعل کے برخلاف پایا جائے تو اس کو واعظ یا ناصح قرار دے کر یہ الزام دینا نہیں چاہیے کہ "اَتَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَکُمْ" بلکہ اس کی طرف سے یہ عذر کرنا چاہیے کہ "اِنّھم یقولونَ مالاَ یفعلونَ"۔

انسان کے کلام میں کہیں کہیں اختلاف یا تناقض پایا جانا ایک ضروری بات ہے بلکہ اُس کے کلام کی پہچان ہی یہ بتائی گئی ہے کما قال اللہ تعالیٰ "لَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اِخْتِلَافًا کَثِیْرًا" مگر جس طرح ایک فلسفی یا مورّخ کی تصنیف میں اختلاف پایا جانا اُس تصنیف کو عیب لگاتا ہے اس طرح شاعر کے کلام کو عیب نہیں لگاتا۔ بلکہ اُس کا بے ساختہ پن ظاہر کرتا ہے جس کو شاعری کا زیور سمجھنا چاہیے فلسفی یا مورّخ ہر ایک چیز پر اُس کے تمام پہلو دیکھ کر ایک مستقل رائے قائم کرتا ہے اور اس لیے ضرور ہے کہ اس کا بیان جامع و مانع ہو لیکن شاعر کا یہ کام نہیں ہے۔ بلکہ اس کا یہ کام ہے کہ ہر ایک شے کا جو پہلو اُس کے سامنے آئے اور اس سے کوئی خاص کیفیت پیدا ہو کر اُس کے دل کو بے چین کر دے اس کو اسی طرح بیان کرے پھر جب دوسرا پہلو دیکھ کر دوسری کیفیت پیدا ہو جو پہلی کیفیت کے خلاف ہو اُس کو اس دوسری کیفیت کے موافق بیان کرے۔ وہ کوئی فلسفہ یا تاریخ کی کتاب نہیں لکھتا تاکہ اُس کو حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو پر نظر رکھنی پڑے

بلکہ جس طرح ایک فوٹوگرافر ایک ہی عمارت کی کبھی روکار کا کبھی پچھیت کا کبھی اِس ضلع کا اور کبھی اُس ضلع کا جدا جدا نقشہ اُتارتا ہے۔ اسی طرح شاعر حقائق و واقعات کے ہر ایک پہلو کو جدا جدا رنگ میں بیان کرتا ہے پس ممکن ہے کہ شاعر ایک ہی چیز کی کبھی تعریف کرے اور کبھی مذمت اور ممکن ہے کہ وہ ایک اچھی چیز کی مذمت کرے اور بُری چیز کی تعریف۔ کیوں کہ خیرِ محض کے سوا ہر خیر میں شر کا پہلو اور شرِّ محض کے سوا ہر شر میں خیر کا پہلو موجود ہے عقل۔ علم۔ زہد۔ دولت۔ عزت اور آبرو عموماً ممدوح و مقبول سمجھی جاتی ہے۔ مگر شعرا نے اُن کی جابجا مذمت کی ہے۔ اسی طرح دیوانگی۔ نادانی۔ رندی۔ فقر۔ ذلت اور رسوائی عموماً مذموم و مردود گنی جاتی ہیں۔ لیکن شعرا ان کے مداح رہے ہیں۔

شاعر ایک ہی چیز کی کبھی ایک حیثیت سے ترغیب دیتا ہے اور کبھی دوسری حیثیت سے اس سے نفرت دلاتا ہے۔ وہ کبھی قدما کے مقابلہ میں اس لیے کہ وہ اُستاد اور موجدِ فن تھے اپنے تئیں ناچیز و بے حقیقت بتاتا ہے اور کبھی اس لیے کہ اُس نے اُن کی دولت میں کسی قدر اپنی کمائی بھی شامل کی ہے جو اُن کے پاس نہ تھی اپنے تئیں اُن پر ترجیح دیتا ہے وہ کبھی دنیا کی اس لیے تحقیر کرتا ہے کہ وہ دار الغرور و دار المحن ہے اور کبھی اُس کی بڑائی و عظمت اس لیے بیان کرتا ہے کہ وہ مزرعۂ آخرت ہے وہ ایک ہی گورنمنٹ کی کبھی اس کی خوبیوں کے سبب سے ستائش کرتا ہے اور کبھی اس کی ناگوار کارروائیوں کے سبب شکایت۔ مگر وہ کبھی ان حیثیتوں کی تصریح نہیں کرتا۔ جن پر اس کے مختلف بیانات مبنی ہوتے ہیں۔ جب ایک پہلو کو بیان کرتا ہے تو گویا دوسرے پہلو کو بالکل بھول جاتا ہے۔ وہ ایک

نادان بچے کی طرح کبھی بے اختیار رو پڑتا ہے اور کبھی ہنسنے لگتا ہے۔ مگر نہ اس کے رونے کا منشا معلوم ہوتا ہے نہ ہنسنے کا۔ پس ممکن ہے کہ شاعر کے کلام میں ایسی بے جوڑ توڑ باتیں دیکھ کر متعجب ہوں۔ مگر جب تک شاعر کا دل اُن کے پہلو میں اور ویسا ہی سودا اُن کے دماغ میں نہ ہو اُن کا تعجب رفع ہونا مشکل ہے۔

بہ زیرِ شاخِ گُل افعی گزیدہ بُلبل را　　نوا گرانِ نخوردہ گزند را چہ خبر

یہ چند اصول جو اوپر بیان کیے گئے اُن سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نکتہ چینوں کی زبان بند کرنی مقصود ہے۔ کیوں کہ جس طرح فوّارہ روکنے سے زیادہ زور کے ساتھ اُچھلتا ہے اس طرح نکتہ چینوں کی زبان بند کرنے سے اور زیادہ کھلتی ہے دوسرے نکتہ چینوں سے کان اس قدر مانوس ہو گئے ہیں کہ جس طرح توپ خانہ کا گھوڑا توپ کی آواز سے کبھی کان نہیں ہلاتا۔ اسی طرح مصنّف نکتہ چینوں کے شور و غل کی پرواہ نہیں کرتے۔ پس ان کی زبان بند کرنے کی نہ طاقت ہے نہ ضرورت۔ البتہ ضرورتِ وقت اس امر کی مقتضی تھی کہ دیباچہ میں یہ چند باتیں جتا دی جائیں۔ ظاہر ہے کہ سویلزیشن جس کو شعر و شاعری کا قاتل کہا جاتا ہے اُس کا پرچھاواں اِس ملک پر بھی پڑنے لگا ہے۔ شعر جس کو مدرسہ میں لے جانے کی اجازت نہ تھی[1] اُس کو روز بروز زیادہ تر مدرسہ ہی کے ساتھ پالا پڑتا جاتا ہے۔ تعلیم ایسے عقل و دانش کے پُتلے جوق جوق اور فوج فوج پیدا کر رہی ہے جو شعرا کے نزدیک ذوقِ معنی سے ایسے ہی بے بہرہ ہیں جیسے شعرا اُن کے نزدیک عقل و دانائی سے۔ اُن پر شعر اتنا بھی اثر نہیں کرتا جتنا کہ عرب کے اونٹ پر حدی خوان کی آواز اثر کرتی

---

[1] یہ اشارہ ہے اُس مشہور مقولہ کی طرف کہ ”شعر مرا بہ مدرسہ مبر“۔

ہے۔ غرض کہ شاعرانہ مذاق یوماً فیوماً ملک سے مفقود ہوتا جاتا ہے۔ اور ایسی علامتیں موجود ہیں جن سے پایا جاتا ہے کہ ہماری شاعری کا چراغ بہت جلد ہمیشہ کے لیے گل ہونے والا ہے۔ نہ پرانی شاعری باقی رہتی نظر آتی ہے اور نہ نئی شاعری آگے چلتی معلوم ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں دیوان شائع کرنا اور شاعری کے متعلق کچھ اصول ایسے بیان نہ کرنے ایسی بات تھی جیسے چین میں عبرانی بائبل شائع کرنی۔ اسی لیے مقدمہ میں مطلق شاعری پر کسی قدر تفصیلی بحث پہلے ہو چکی ہے اور چند باتیں جو خاص اس مجموعہ سے علاقہ رکھتی تھیں وہ اب دیباچہ میں بیان کی گئیں لیکن اگر غور کیجیے تو ان میں سے کوئی چیز بھی ضروری نہ تھی۔ مقدمہ اور دیباچہ لکھنا تو درکنار، سرے سے شعر کہنے ہی کی کچھ ضرورت معلوم نہیں ہوتی۔

"آنچہ ما درکار داریم اکثرے درکار نیست"

مگر مدبر السموات والارض نے اس خرابہ آباد دنیا کی رونق اور بہار ہماری اسی غفلت و نادانی پر موقوف رکھی ہے کہ دن رات یہاں کے گورکھ دھندوں میں الجھے رہیں۔ دھوکہ کو حقیقت اور خواب کو بیداری سمجھیں اور جس کوشش و جانفشانی کے ساتھ کہ مکڑی عمر بھر اپنے بودے اور کم زور جالے کو پورنے میں سرگرم رہتی ہے اسی کوشش و جاں فشانی کے ساتھ ہم بھی اپنی بے بنیاد اور ناپائدار ہوائی عمارتیں چنتے رہیں یہاں تک کہ فنا ہو جائیں۔

درکارخانہ کہ بنایش بہ غفلت ست
ہشیار زیستن نہ ز قانون حکمت ست

[1]نَرُوحُ وَنَغْدُو لِحَاجَاتِنَا   وَحَاجَةُ مَنْ عَاشَ لَا تَنْقَضِي
وَيَسْلُبُهُ الْمَوْتُ اَثْوَابَهُ   وَيَمْنَعُهُ الْمَوْتُ مَا يَشْتَهِي
تَمُوْتُ مَعَ الْمَرْءِ حَاجَاتُهُ   وَتَبْقَى لَهُ حَاجَةٌ مَا بَقِي

---

[1] ترجمہ۔ ہم اپنے کاموں میں صبح شام سرگرم ہیں اور جو شخص زندہ ہے اُس کا کام ختم نہیں ہو سکتا۔ موت ہی اُس کے کپڑے اُتروائیگی اور موت ہی اُس کی خواہشوں کا خاتمہ کرے گی۔ انسان کی خواہشیں اس کے ساتھ ہی مریں گی۔ جب تک وہ زندہ ہے کوئی نہ کوئی خواہش اُس کے ساتھ لگی ہوئی ہے۔

* * *

قطعات

چھوٹوں کا بڑا بن جانا

چند خطوط ایک دانا نے کھینچ کے یاروں سے یہ کہا
دیکھو ان میں جتنے ہیں خط کوئی ہے چھوٹا کوئی بڑا
ہے کوئی؟ جو بے ہاتھ لگائے دے یونہی چھوٹے خط کو بڑھا
ایک نے جتنے خط تھے بڑے اٹھ کے دیا ایک اک کو مٹا
جب نہ رہا واں پیشِ نظر خط کوئی چھوٹے خط کے سوا
دیکھتا تھا اٹھا کر آنکھ جدھر تھا وہی چھوٹا وہ ہی بڑا
کل کی ہے یارو بات کہ تھی قوم میں باقی جب ان ذرا
قوم میں جیسا حال ہے اب آدمیوں کا کال نہ تھا
تھے موجود ادیبوں میں اخطل و اعشیٰ کے ہمتا
منشیوں میں ایسے تھے بہت جن پہ کہ نازاں تھی انشا
شعر میں تھے استاد اکثر سحرِ بیان اور نکتہ سرا
لے گئی ان کو آخر کار بحرِ فنا کی موج بہا
اہلِ ہنر کا نام و نشاں قوم میں جب باقی نہ رہا

حالی و زید و عمر سے بنے　　صاحبِ دیوان نامِ خدا
اب جو چاہو۔ اُستاد گنو　　یا ہمیں سمجھو تم یکتا
ہم ہیں وہی ناچیز مگر　　گبرَّنا مَوتُ الکُبرا

شعر کی طرف خطاب

اے شعرِ دل فریب نہ ہو تُو، تو غم نہیں　　پر تجھ پہ حیف ہے جو نہ ہو دل گداز تو
صنعت پہ ہو فریفتہ عالم اگر تمام　　ہاں سادگی سے آئیو اپنی نہ باز تو
جوہر ہے راستی کا اگر تیری ذات میں　　تحسینِ روزگار سے ہے بے نیاز تو
حُسن اپنا گر دکھا نہیں سکتا جہان کو　　آپ کو دیکھ اور کر اپنے پہ ناز تو
تو نے کیا ہے بحرِ حقیقت کو موج خیز　　دھوکے کا غرق کر کے رہیگا جہاز تو
وہ دن گئے کہ جھوٹ تھا ایمانِ شاعری　　قبلہ ہو اب ادھر تو نہ کیجو نماز تو
اہلِ نظر کی آنکھ میں رہنا ہے گر عزیز　　جو بے بصر ہیں اُن سے نہ رکھ ساز باز تو
ناک اوپری دوا سے تری گر چڑھائیں لوگ　　معذور جان اُن کو جو ہے چارہ ساز تو
چُپ چاپ اپنے بیج سے بوئے جا یونہی مگر　　اونچا ابھی نہ کر علَمِ امتیاز تو
جو نابلد ہیں اُن کو بتا چور بن کے راہ　　گر چاہتا ہے خضر کی عمرِ دراز تو
عزت کا بھید ملک کی خدمت میں ہے چھپا　　محمود جان آپ کو گر ہے ایاز تو
اے شعر راہِ راست پہ تو جب کہ پڑ لیا　　اب راہ کے نہ دیکھ نشیب و فراز تو
کرنی ہے فتح گر نئی دنیا تو لے نکل　　بیڑوں کا ساتھ چھوڑ کے اپنا جہاز تو

ہوتی ہے سچ کی قدر یہ بیقدریوں کے بعد
اس کے خلاف ہو تو سمجھ اس کو شاذ تو
جو قدرداں ہو اپنا اُسے مغتنم سمجھ
حالی کو تجھ پہ ناز ہے گر اُس پہ ناز تو

مشاعرہ کی طرح پر غزل نہ لکھنے کا عذر

ہوئی ریعانِ جوانی کی بہار آخر حیف
طبعِ رنگیں تھی مے عشق کی جب متوالی
اپنی روداد تھی جو عشق کا کرتے تھے بیاں
جو غزل لکھتے تھے ہوتی تھی سراسر حالی
اب کہ اُلفت ہی نہ چاہت نہ جوانی نہ اُمنگ
سر ہی سودا سے ہے تہی عشق سے دِل ہی خالی
گر غزل لکھیے تو کیا لکھیے غزل میں آخر
نہ رہی چیز وہ مضمون سُجھانے والی
آپ بیتی نہ ہو جو وہ ہے کہانی بے لطف
گرچہ ہوں لفظ فصیح اور زباں ٹکسالی
ہاں مگر کیجیے کچھ عشق کا غیروں کے بیاں
لائیے باغ سے اوروں کے اُڑا کر ڈالی
کھینچیے وصلِ صنم کی کبھی فرضی تصویر
کیجیے دردِ جدائی کی کبھی نقّالی
تاکہ بھڑکائیے جوانوں کے دِل آتش کی طرح
وہ ہوا جس سے دماغ اپنا ہوا ہے خالی
پر یہ ڈر ہے کہیں اپنی بھی وہی ہو نہ مثل
قحبہ چوں پیر شود پیشہ کند دلّالی

نکتہ چینی

باپ نے بیٹے کو سمجھایا کہ علم و فضل میں
جس طرح بن آئے بیٹا نام پیدا کیجیے
کیجیے تصنیف اور تالیف میں سعیِ بلیغ
اس میں ایک اپنا پسینہ اور لہو کر دیجیے
دیجیے معنی کے نظم و نثر میں دریا بہا
اور سخن کی داد ہر پیر و جواں سے لیجیے
اور نہ ہو گر شعر و انشا کی لیاقت آپ میں
شاعروں اور منشیوں پر نکتہ چینی کیجیے

بے تمیزی ابنائے زماں

ازرہِ فخر آبگینہ سے یہ ہیرے نے کہا
ہے وجود اے مبتذل تیرا برابر او رعدم
جنس تیری کس مپرس اور قدر و قیمت تیری ہیچ
تیرے پانے کی خوشی کچھ اور نہ گم ہونیکا غم
دے کے دھوکا تو اگر الماس بن جائے تو کیا
امتحاں کے وقت کھل جاتا ہے سب تیرا بھرم
مسکرا کر آبگینہ نے یہ ہیرے سے کہا
گو کہ ہے رتبہ ترا مجھ سے بڑا اے محترم
مجھ میں اور تجھ میں مگر کر سکتے ہیں جو امتیاز
ہیں مبصر ایسے اس بازار ناپرساں میں کم
تیرے جوہر گو نہیں موجود اپنی ذات میں
تجھ سے اے الماس لیکن اچھے پڑے رہتے ہیں ہم

ایک خود پسند امیر زادہ کی تضحیک

کہتے ہیں اِک امیر زادہ کو
تھا خدنگ افگنی کا شوق کہیں
خصلتیں جو امیر زادوں میں
لازمی ہیں وہ اُس میں بھی سب تھیں
گو کہ رکھتا نہ تھا ہنر کوئی
اُس پہ تھا خود پسند اور خود بیں
کچھ نہ تھا۔ پر سمجھتا تھا سب کچھ
علم تیر و کماں میں اپنے تئیں
واہ وا سنتے سنتے یاروں کی
ہو گیا تھا ہنر کا اپنے یقیں
الغرض ایک روز صحرا میں
جب کہ تھے ساتھ سب جلیس و قریں
مشقِ تیر افگنی میں تھا مصروف
کر رہے تھے خوشامدی تحسیں
آ کے دیکھا جو اِک ظریف نے حال
وجہ تحسیں ہوئی نہ ذہن نشیں
تیر جتنے کماں سے چھوٹے
پائے سب نے اصول و بے آئیں

جا کے بھولے سے بھی نہ پڑتا تھا
تیر۔ آما جگہہ کے کوئی قریں
ایک جاتا تھا چھوٹ کے سوئے شمال
ایک جاتا تھا پھٹ کے سوئے یمیں
کچھ جو شوخی ظریف کو سوجھی
رکھ کے بالائے طاق سب تمکیں
خاک تو دہ پہ جا کے ہو بیٹھا
لوگ کرتے رہے چناں و چنیں
ناوک انداز بولا چلّا کر
کوئی تجھ کو جنوں ہے، اے مسکیں
یا خفا ہو کے گھر سے آیا ہے
یا کہ دو بھر ہے تجھ کو جانِ خزیں
عرض کی چارہ کیا ہی اس کے سوا
جب کہ جائے گریز ہو نہ کہیں
زد سے ان بے، پناہ تیروں کے
کہیں جاں دار کو امان نہیں
مجکو ہر پھیر کے شش جہت میں حضور
امن کی اِک جگہ ملی ہے یہیں

پولٹکل اسپیچیں

اے بزم سفیرانِ دول کے سخن آرا
ہر خورد و کلاں تیری فصاحت پہ فدا ہے
یہ سچ ہے کہ جادو ہی بیاں میں ترے لیکن
کچھ سحر بیانی کا تری ڈھنگ نیا ہے
ظاہر ہے نہ غصّہ میں بیاں سے ترے رنجش
نے لطف میں کچھ طرزِ بیاں اس سے جُدا ہے
ہے دل میں نہاں ایک شکایات کا طومار
اور لب پہ جو دیکھو تو نہ شکوہ نہ گلا ہے
جو صلح کی باتیں ہیں وہ ہیں شہد سے شیریں
اور جنگ میں کچھ لطفِ سخن اس سے سوا ہے
گر سوچیے تو سیکڑوں پہلو ہیں مفسر کے
اور سُنیے تو زنجیروں سے ہر قول بندھا ہے
دل کی ترے ہوتی نہیں معلوم کوئی بات
گونگا نہیں گویا نہیں کیا جانیے کیا ہے
کُھلتا نہیں کچھ اس کے سوا تیرے بیان سے
اِک مُرغ ہے خوش لہجہ کہ کچھ بول رہا ہے

تھے لب، پئے اظہار، پہ اب آ کے کھُلا یہ   انسان کو اخفا کے لیے نطق مِلا ہے

بدی کر کے نیکنامی کی توقع رکھنی

نا منصف و بے رحم تھا اِک ضلع کا حاکم   برتاؤ سے نالاں تھی بہت جس کے رعیت
جب دورہ کو اُٹھتا تھا تو دیہات میں جا کر   تھا پوچھتا ایک ایک سے از راہِ شرارت
ہیں پرگنہ کے لوگ سمجھتے ہمیں کیسا   کرتے ہیں ہماری وہ ستائش کہ مذمت
تھی اُس کی مثال ایسی کہ ایک شخص بدآواز   جس کو کہ خود آواز سے تھی اپنی کراہت
گاتا تھا کھڑے ہو کے اور آواز کے پیچھے   ہر بار لپکتا تھا بصد تیزی و سُرعت
ہوتا کہ یہ معلوم کہ ہے دور سے میری   آواز خوش آئند و یا قابلِ نفرت

تفاخر سے نفرت کرنے پر تفاخر

زاہد نے کہا "زینت و اسباب پہ جو لوگ   اِتراتے ہیں۔ اِک آنکھ مجھے وہ نہیں بھاتے"
حالی نے کہا "جن کو ہے اِترانے سے نفرت   اِترا کے وہ اس طرح نہیں ناک چڑھاتے

سیّد احمد خاں کی تکفیر

مختلف اقوال ہیں اسلام کی تعریف میں   بعض کے نزدیک توحید اس کی حدِ تام ہے
ہے مگر جمہور کے نزدیک یہ مردود قول   جو ہیں قائل اس کے اُن پر کفر کا الزام ہے
کیونکہ اس سے ماننا پڑتا ہے اس رحمت کو عام   جس سے غیر از اہلِ قبلہ جو ہے وہ ناکام ہے
بعض کہتے ہیں کہ شر سے تیرے سب ایمن ہیں   بس مسلمانی و دیں داری اسی کا نام ہے

پر یہ حد بھی جامع و مانع نہیں عند الفحول
کہتے ہیں اسلام جو سمجھے اُسے وہ خام ہے

ایمنی کا مستحق ہے خاص کر اپنا گروہ
اور سب کا لفظ یار اغیار سب کو عام ہے

بعض کہتے ہیں شعار اسلامیوں کا ہی لباس
جو لباسِ غیر پہنے خارج از اسلام ہے

بعض بتلاتے ہیں کچھ اور بعض فرماتے ہیں کچھ
حصر کرنا اُن تمام آرا کو مشکل کام ہے

مذہبِ منصور[1] ہے لیکن بیاں کرنا ضرور
جو مسلّم آج کل نزدیک خاص و عام ہے

اہلِ حل و عقد ہیں اب متفق اس رائے پر
سیّد احمد خاں کو کافر جاننا اسلام ہے

قرض لیکر حج کو جانے کی ضرورت

قریب موسمِ حج۔ قرض لے کے اک دیندار
چلا بہ نیتِ حج۔ گھر سے سوئے بیت اللہ

کہا یہ اُس سے اک آزاد نے کہ اے حضرت
کیا ہے آپ پہ شارع نے جبر یا اکراہ

کہ قرض لے کے چلے ہیں حضور سوئے حجاز
وطن میں چھوڑ کے اطفال کو بحالِ تباہ

نہ نان و نفقہ فرزند و زن سے خاطر جمع
نہ زاد و راحلہ کا ساز و برگ خاطر خواہ

سُنا یہ۔ اور بہت ترش ہو کے فرمایا
کہ روکتا ہے مسلماں کو حج سے اے گمراہ

وہ بادشاہ کہ جو دشمنوں کو دیتا ہے
نگینِ خاتم و طبل و نشان و تخت و کلاہ

خبر نہ لے گا وہ کیا اپنے مہمانوں کی
پہنچتے جو کہ ہیں طے کر کے بحر و بر کی راہ

جنہیں فراغت و تنگی میں ہے اُسی سے اُمید
جنہیں سلامت و آفت میں ہے اُسی کی پناہ

وہ سُن کے بولا کہ ناخواندہ مہمانوں کی
اُمید لطف کی رکھنی ہے میزباں سے گناہ

ذلیل ہوتے ہیں جو بن بلائے جاتے ہیں
طفیلیوں کی نہیں دعوتوں میں عزت و جاہ

---

[1] اقوالِ مختلفہ میں سے جو قول راجح ہو اُس کو مذہبِ منصور کہتے ہیں۔ ۱۲

ملا کے پاس پھر آہستہ اُس سے فرمایا
ابھی زمانہ کی چالوں سے تو نہیں آگاہ
قدم پہنچتے جہاں تک ہیں پختہ کاروں کے
جوانِ خام کی واں تک نہیں پہنچتی نگاہ
خدا کے حکم ہیں مبنی تمام حکمت پر
فتوح جن میں ہے دنیا و دیں کی خاطر خواہ
نماز و روزہ ہو یا ہو طواف و عمرہ و حج
حصول جیسے کہ ہوتا ہے اُن سے قربِ الٰہ
اسی طرح یہ وسیلے معاش کے ہیں تمام
نہ جن میں چاہیے محنت نہ کوشش جانکاہ
مگر سلیقہ و تدبیر شرط ہے ورنہ
ہزاروں پھرتے ہیں حجاج سادہ لوح تباہ
یہ کہنے سننے کی باتیں نہیں ہیں برخوردار
وگرنہ علم معیشت وسیع ہے واللہ

آزادی کی قدر

ایک ہندی نے کہا۔ حاصل ہے آزادی جنہیں
قدرداں اُن سے بہت بڑھکر ہیں آزادی کے ہم
ہم کہ غیروں کے سدا محکوم رہتے آئے ہیں
قدر آزادی کی جتنی ہم کو ہو اُتنی ہے کم
عافیت کی قدر ہوتی ہے مصیبت میں سوا
بے نوا کو ہے زیادہ قدرِ دینار و درم
تعرف الاشیاء بالاضداد ہے قولِ حکیم
دیکھا قیدی سے زیادہ کون آزادی پہ دم
سُن کے اک آزاد نے یہ لاف پھبکی سے کہا
ہے سقر[1]۔ موری کے کیڑے کے لئے باغ ارم

انگلستان کی آزادی اور ہندوستان کی غلامی

کہتے ہیں ”آزاد ہو جاتا ہے جب لیتا ہے سانس
یاں غلام آکر۔ کرامت ہے یہ انگلستان کی

---

[1] یعنی جس طرح موری کے کیڑے کو موری ہی میں آرام ملتا ہے اور وہاں سے کہیں جانا نہیں چاہتا اسی طرح جو قومیں ہمیشہ محکوم رہتی چلی آئی ہیں وہ غلامی ہی میں خوش رہتی ہیں۔ ۱۲

اس کی سرحد میں غلاموں نے جونہی رکھا قدم
اور کٹ کر پانو سے ایک اک کے بیڑی گر پڑی
قلبِ ماہیت میں انگلستان ہے گر کیمیا
کم نہیں کچھ قلبِ ماہیت میں ہندوستان بھی
آن کر آزاد۔ یاں آزاد رہ سکتا نہیں
وہ رہے ہو کر غلام۔ اس کی ہوا جن کو لگی

سیّد احمد خاں کی مخالفت کی وجہ

سیّد احمد خاں کے اِک منکر سے یہ پوچھا کہ آپ
کِس لیے سیّد سے صاف اے حضرت والا نہیں
کافر و ملحد ہمیشہ اس کو ٹھیراتے ہیں آپ
ثابت اسلام اُس کا۔ نزدیک آپ کے گویا نہیں
آپ بھی (نامِ خدا) ہیں تارکِ صوم و صلوٰۃ
اور سلوک اسلام سے خود آپ کا اچھا نہیں
خود نبوت پر سنے ہیں ہم نے ایراد آپ کے
اور اُلوہیت سے بھی دل جمع حضرت کا نہیں
چشمِ بد دُور آپ کا بھی جب کہ ہے مشرب وسیع
پھر یہ سیّد پر تبرّا آپ کو زیبا نہیں
سُن کے فرمایا "اگر ہو پوچھتے انصاف سے
بات یہ ہی۔ سُن لو صاحب تم سے کچھ پڑا نہیں
رنج کچھ اس کا نہیں مجکو کہ وہ ایسا ہے کیوں
بلکہ ساری کوفت ہے اس کی کہ میں ویسا نہیں"

قحطِ اہل اللہ

کل خانقاہ میں تھی حالت عجیب طاری
جو تھا سو چشم پُرنم۔ اپنا تھا یا پرایا
"دنیا سے اُٹھ گئے سب جو تھے مُرید صادق"
یہ کہکے شیخ کا دل بے ساختہ بھر آیا
ہم نے کہا مُریدی باقی رہی نہ پیری
یہ کہہ کے ہم بھی روئے اور اُسکو بھی رلایا

نوکروں پر سخت گیری کرنیکا انجام

ایک آقا تھا ہمیشہ نوکروں پر سخت گیر
درگزر تھی اور نہ ساتھ اُن کے رعایت تھی کہیں
بے سزا کوئی خطا ہوتی نہ تھی اُن کی معاف
کام سے مہلت کبھی ملتی نہ تھی اُن کے تئیں
حُسنِ خدمت پر اضافہ یا صلہ تو درکنار
ذکر کیا۔ نکلے جو چھوٹے مُنہ سے اُسکے آفریں
پاتے تھے آقا کو وہ۔ ہوتے تھے جب اُس سے دوچار
نتھنے پھولے، مُنہ چڑھا۔ ماتھے پہ بَل ابرو پہ چیں
تھی نہ جز تنخواہ نوکر کے لیے کوئی فتوح
آگے ہو جاتے تھے خائن جو کہ ہوتے تھے امیں
رہتا تھا اِک اِک شرائط نامہ ہر نوکر کے پاس
فرض جتنے نوکر اور آقا کے ہوتے تھے تعیں
گر رعایت کا کبھی ہوتا تھا کوئی خواستگار
زہر کے پیتا تھا گھونٹ آخر بجائے انگبیں
حکم ہوتا تھا شرائط نامہ دکھلاؤ ہمیں
تاکہ یہ درخواست دیکھیں واجبی ہے یا نہیں
واں سوا تنخواہ کے تھا جس کا آقا ذمہ دار
تھی گریں جتنی وہ ساری نوکروں کے ذمہ تھیں
دیکھ کر کاغذ کو ہو جاتے تھے نوکر لاجواب
تھے مگر وہ سب کے سب آقا کے مارِ آستیں
ایک دن آقا تھا اِک مُنہ زور گھوڑے پر سوار
تھک گئے جب زور کرتے کرتے دستِ نازنیں
دفعتہً قابو سے باہر ہو کے بھاگا راہوار
اور گرا اسوار۔ صدرِ زیں سے بالائے زمیں
کی بہت کوشش۔ نہ چھوٹی پانو سے لیکن رکاب
کی نظر سائیس کی جانب کہ ہو آکر معیں
تھا مگر سائیس ایسا سنگ دل اور بے وفا
دیکھتا تھا اور ٹس سے مس نہ ہوتا تھا لعیں
دور ہی سے تھا اُسے کاغذ دکھا کر کہہ رہا
دیکھ لو سرکار اس میں شرط یہ لکھی نہیں

نیشن کی تعریف

یہ ہے مانی ہوئی جمہور کی رائے
اسی پر ہے جہاں کا اتفاق اب
کہ نیشن وہ جماعت ہے کم ازکم
زباں جس کی ہو ایک اور نسل و مذہب
مگر وسعت اُسے بعضوں نے دی ہے
نہیں جو رائے میں اپنی تذبذب
وہ نیشن کہتے ہیں اُس بھیڑ کو بھی
کہ جس میں وہ حدیں مفقود ہوں سب
زباں اِس کی نہ ہو مفہوم اُس کو
ہوں آدم تک جُدا اس کے جدّ و اَب
جو واحد لاشریک اُس کا خدا ہو
تو لاکھوں اُس کے ہوں معبود اور رب

صفائی نہ رکھنے کا عُذر

راہ سے گزرا کہیں مَیلا کچیلا اِک غلام
اُس کے مَیلے پن پہ لوگوں نے ملامت اُس کو کی
عرض کی "ایک اک رواں ہو جس بدن کا مِلکِ غیر
اختیار اُس کی صفائی کا نہیں رکھتے رہی غلام
جو ہیں آزاد اور صفائی کا نہیں رکھتے خیال
عُذر میلے پن کا شاید وہ بھی رکھتے ہوں یہی
کیونکہ جسم آدمی ہیں پیشِ اہلِ معرفت
کوئی چیز اس کی نہیں سب ہے امانت گور کی

دِلّی کی شاعری کا تنزّل

اک دوست نے حالی سے کہا ازرہِ انصاف
کرتے ہیں پسند اہلِ زباں اُس کے سخن کو
چند اہلِ زباں جن کو کہ دعویٰ تھا سخن کا
بولے کہ "نہیں جانتے تم شعر کے فن کو
شاعر کو یہ لازم ہے کہ ہو اہلِ زباں سے
ہو چھو نہ گئی غیر زباں اُس کے دہن کو

معلوم ہے حالی کا ہے جو مولد و منشا
اُردو سے بھلا واسطہ؟ حضرت کے وطن کو
اُردو کے دھنی وہ ہیں جو دلّی کے ہیں روڑے
پنجاب کو مس اس سے نہ پورب نہ دکن کو
بُلبُل ہی کو معلوم ہیں انداز چمن کے
کیا عالم گلشن کی خبر زاغ و زغن کو
حالی کی زباں گر بمثلِ نہرِ لبَن ہو
خالص نہ ہو تو کیجیے کیا لے کے لبَن کو
ہرچند کہ صنعت سے بنا لے کوئی نافہ
پہنچے گا نہ وہ نافہ آہوئے ختن کو
مانا کہ ہے کہ بے ساختہ پن اُسکے بیاں میں
کیا پھونکیے اِس ساختہ بے ساختہ پن کو
یہ دوست نے حالی کے سُنی جب کہ تعلّی
حق کہنے سے وہ رکھ نہ سکا باز دہن کو
کچھ شعر تھے یاد اُن کے پڑھے اور یہ پوچھا
کیوں تھا جو عزت اِسی اُردو سے ہی فن کو
سچ یہ ہی کہ جب شعر ہوں سرکار کے ایسے
کیوں آپ لگے ماننے حالی کے سخن کو
حالی کو تو بدنام کیا اُس کے وطن نے
پر آپ نے بدنام کیا اپنے وطن کو

بیٹیوں کی نسبت

جاہلیت کے زمانہ میں تھی یہ رسم عرب
کہ کسی گھر میں اگر ہوتی تھی پیدا دختر
سنگدل باپ اسے گود سے لیکر ماں کی
گاڑ دیتا تھا زمیں میں کہیں زندہ جا کر
رسم اب بھی یہی دنیا میں ہے جاری لیکن
جو کہ اندھے ہیں ہمیشہ کی نہیں کچھ اُنکو خبر
لوگ بیٹی کے لیے ڈھونڈھتے ہیں جب بر یونہ
سب سے اوّل اُنھیں ہوتا ہے یہ منظورِ نظر
ایسے گھر بیاہیے بیٹی کو جو ہو آسودہ
اور مہ و مہر سے جو ذات میں ہو افضل تر
جانے پہچانے ہوں سمدھیانے کے سارے زن و مرد
اُن کے معلوم ہوں عادات و خصائل یکسر
ایک ہی شہر میں ہوں دونوں گھرانے آباد
دونو نزدیک قرابت میں ہوں باہم دیگر

جیتے جی مرگئی بس اُن کی طرف سے گویا
جا کے پردیس میں بیٹی کو دیا بیاہ اگر

چھان بین اس کی تو کرتے ہیں کہ گھر کیسا ہو
پر نہیں دیکھتا یہ کوئی کہ کیسا ہو بَر

بد مزاجی ہو۔ جہالت ہو۔ کہ ہو بَد چلنی
کچھ بُرائی نہیں۔ ذ تونتا ہو داماد اگر

وہ بھی ناشدنی رہتی ہے جس کے کارن
بکریاں بھیڑیوں سے پاتی ہیں پیوند اکثر

جاہلیت میں تو تھی اِک یہی آفت کہ وہاں
گاڑ دی جاتی تھی بس خاک میں تنہا دختر

ساتھ بیٹی کے مگر اب پدر و مادر بھی
زندہ در گور سدا رہتے ہیں اور خستہ جگر

اپنا اور بیٹیوں کا جب کہ نہ سوچیں انجام
جاہلیت سے کہیں ہے وہ زمانہ بَدتر

سیّد احمد خاں کی تصانیف کی تردید

اِک مولوی کہ تنگ بہت تھا معاش سے
برسوں رہا تلاش میں وجہ معاش کی

وہ شہر شہر نوکری کی ڈھونڈ میں پھرا
لیکن نہ اُس کے ہاتھ کہیں نوکری لگی

اخبار بھی نکال کے بخت آزمائی کی
تدبیر یہ بھی اُس کی نہ تقدیر سے چلی

روزی کی خاطر اُس نے کیے سیکڑوں جتن
پر۔ کی کہیں نصیب نے اُس کے نہ یاوری

راہِ طلب میں جب ہوئی سرگشتگی بہت
اِک خضرِ پے خجستہ نے کی آکے رہبری

جُھک کر کہا یہ کان میں اُس کے کہ آجکل
سُنتا ہوں چھپ رہی ہے تصانیفِ احمدی

جا۔ اور لفظ لفظ کو اُس کے تتھیٹر کر
تردید اُس کی چھاپ دے جو ہو بری بھلی

پھر دیکھنا کہ راس وچپ و گرد و پیش سے
لگتی ہے کیسی آکے زروسیم کی جھڑی

دنیا طلب کو چاہیے ابلہ فریب ہو
دُنیا پہ جب تلک کہ مسلّط ہے ابلہی

یقین

آتی نہیں ہے شرم تجھے اے خدا پرست
دل میں کہیں نشاں نہیں تیرے یقین کو
جی میں ترے ہزاروں گزرتے ہیں وسوسے
ہوتی نہیں قبول تری اک اگر دعا
تجھ سے ہزار مرتبہ بہتر ہے بُت پرست
جس کا یقین ہے تیرے یقیں سے کہیں سوا
وہ مانگتا بتوں سے مُرادیں ہے عمر بھر
گو حاجت اُس کی اُن سے ہوئی ہو نہ ہو روا
آتا نہیں یقین میں اُس کے کبھی قصور
اُمید اُس کی روز فزوں ہے اور التجا
تو بندۂ غرض ہے وہ راضی رضا پہ ہے
وہ ہے کہ یہ ہے بندگی ، اے بندۂ خدا

استفادہ

لیجیے بھیک دوڑ کر۔ گر ہے گداگری کا یہ
جس سے بنے جہاں ملے جو ملے اور جب ملے
ہے یہی اہل اکتساب ہوجیے سب سے مستفید
زک ملے یا مزا ملے۔ درس ملے۔ ادب ملے

لایق آدمی دوست اور دشمن دونوں سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں

قول ایک حکیم کا ہے کہ "گر غور کیجیے
ہے حق میں سب کے دوست سے دشمن مفید تر
اوّل تو سوجھتا ہی نہیں عیب دوست کو
اور سوجھتا ہے تو نہیں لاتا زبان پر
پر ایک بار دشمن اگر دیکھ پائے عیب
سو سو طرح سے وہ اُسے کرتا ہے جلوہ گر
دشمن سے بڑھ کے کوئی نہیں آدمی کا دوست
منظور اپنے حال کی اصلاح ہو اگر
اور دوست سے زیادہ نہیں کوئی بدسگال
رکھتا ہے جو کہ دوست کے عیب اُس سے مستتر"

Kashmir University
Iqbal Library
Acc. No. 503529

گو قول ہے متین پہ جو تھی سخن کی تہہ
افسوس ہے حکیم کی پہنچی نہ واں نظر

دشمن کے جو کہ طعن سے ہوتے ہیں مستفید
عیب اُن کے دوست کیوں نہ جتائینگے بیخطر

اور جو کہ دوست سے نہیں سن سکتے اپنے عیب
وہ دشمنوں کے طعن سے کیا ہونگے بہرہ ور

جن کو خدا نے جوہر قابل دیا ہے یاں
موقوف عبرت[1] اُن کی نہ دشمن نہ دوست پر

سخن سازی

ہے مردِ سخن ساز بھی دُنیا میں عجب چیز
پاؤ گے کسی فن میں کہیں بند نہ اُس کو

موجود سخن گو ہوں جہاں واں ہیں طبیب آپ
اور جاتے ہیں بن آپ طبیبوں میں سخن گو

دونوں میں سے کوئی نہ ہو تو آپ ہیں سب کچھ
پر ہیچ ہیں جس وقت کہ موجود ہوں دونو

عقل اور نفس کی گفتگو

نفس کو عقل نے چاہا کہ کرے خوار و زبوں
اپنے دعووں پہ بیاں کر کے دلیل و برہاں

کہا اے نفس نہیں تجھ میں مآل اندیشی
درد ہیں تیرے اسی واسطے سب بے درماں

ہے غنیمت تجھے وہ رات کی دم بھر کی خوشی
جس کا آتا ہے نظر پیشتر از صبح زیاں

سود سے کچھ تجھے رغبت نہ زیاں سے پرہیز
تیرے نزدیک ہے درد اور دوا سب یکساں

نہیں غفلت میں تجھے دین نہ دنیا کی خبر
یہ بھی ہے نیند کوئی موت کا ہے جس پہ گماں

نہ جوانی میں تجھے صبر۔ نہ پیری میں شکیب
کبھی ہوتا نہیں کم تیری خودی کا طوفاں

کہیں جائے نہ بھٹک منزلِ مقصود سے تو
دیکھ۔ جاتا ہے کدھر اور تجھے جانا ہے کہاں

---

[1] عبرت و اعتبار نصیحت حاصل کرنا۔ ۱۲

ہاتھ دھو لذتِ فانی سے نہیں گر منظور
عیش باقی و حیاتِ ابدی سے حرماں
نفس نے عقل سے کی عرض کہ اے خضرِ طریق
وعظ پر تیرے ہے زیبا کہ فدا کیجئے جاں
پر نہیں حکم ترا کوئی عمل کے قابل
گو کہ حکمت سے بھرا تیرا سراسر ہے بیاں
نقد کو چھوڑنا اور نسیہ کی رکھنی امید
کوئی تسلیم کرے گا نہ اسے جز ناداں
ہے یہ ایک ایک مری لذتِ فانی وہ بلا
سو حیاتیں ابدی تیری ہیں جس پر قرباں
ایک اب بھوکے سے کہتا ہی کہ رے تابِ طعام
ایک مدعو اُسے کرتا ہے پس از سالِ رواں
کیونکہ اُمید پہ اک مائدۂ نعمت کی
سال بھر صبر کرے گرسنگی میں انساں
عقل نے سن کے کہا خوف ہی تجھسے اے نفس
جذبہ یہ تیرا مجھے دیکھیے پہنچائے کہاں
حق کے پیرایہ میں ہوتا نہیں باطل ہمسر
کیجئے لاکھ بیاں اس پہ دلیل و برہاں
جاں بلب بھوک سے ہو گرسنہ بالغرض اگر
زہر دانستہ کرے نوش۔ نہیں یہ امکاں
نہ کہیں بھوک میں کھا بیٹھیو یہ لقمۂ نقد
اس کے کھانے میں نہیں جان کی خیر اے ناداں

عادت کا غلبہ عقل پر

دیکھ عادت کا تسلط میں نے عادت سے کہا
گھیر لی عقلِ صواب اندیش کی سب تو نے جائے
ہنس کے عادت نے کہا کیا عقل ہے مجھسے الگ؟
میں ہی بن جاتی ہوں ناداں رفتہ رفتہ عقل و رائے

شعرا کو سلطنت میں دخل دینا

سنتے ہیں یہ اک مدبر کی ہے رائے
چاہیے گر رونقِ علم زباں
شاعروں کو سلطنت کا کیجئے رکن
جن پہ اسکی سب کانیں ہیں عیاں

رائے صائب ہی بہ ظاہر اور متیں   گو کیا اس کا نہیں کچھ امتحاں
شعر و انشا کو تو ہو شاید فروغ   ہی بہت کم بر خلاف اسکے گماں
سلطنت کا پر خدا حافظ ہی جب   شاعروں کے ہاتھ ہو اسکی عناں
اور جو وہ شاعر ہیں ہندوستان کے   شعر و انشا کو بھی ہی خوفِ زیاں
ایک پر اُن میں سے چل سکتا نہیں   دوسرے کا جادوے حسنِ بیاں
ایک جب چلنے نہ دیگا ایک کی   پھر ترقی شعر و انشا کی کہاں

لوگ کسی کی خوبیاں سُن کر اتنے خوش نہیں ہوتے جتنے کہ اُس کے عیب سُن کر

اپنے عیبوں کے ہیں ہم جتنے کہ ممنوں حاؔلی   اُس قدر خوبیوں کے اپنی نہیں شکر گذار
لوگ جب عیب ہمارا کوئی سُن پاتے ہیں   گو کہ کرتے ہیں تاسّف کا بظاہر اظہار
پر خوشی کا ہے یہ عالم کہ ہو پہنچ اُن کو کمال   گر نصیبوں سے وہ افواہ غلط پائے قرار
اور جو ہو گوش زد اُن کے کوئی خوبی اپنی   خوش تو پڑتی ہی بنانی اُنھیں صورت ناچار
دل میں ہوتا ہے مگر غم کا یہ عالم اُن کے   کہ ملال اپنا چھپا سکتے نہیں وہ زنہار
للہ الحمد کہ مخلوق کے خوش کرنے کا   نفس میں اپنے ہے سامان بہت کچھ تیار

شائستہ لوگوں کا برتاؤ سائل کے ساتھ

عادت تھی اِک فقیر کی کرتا تھا جب سوال   انگریز کے سوا نہ کسی سے تھا مانگتا

مدت تک اُس کی جب یہی دیکھی گئی روش   پوچھا کسی نے اُس سے کہ اِس کا سبب ہے کیا
بولا کہ عادت اِس لیے کی ہے یہ اختیار   چھٹ جائے تا کہ مجھ سے یہ لپکا سوال کا
پہلے جو بھاگوانوں سے ملتی تھی روز بھیک   آتا تھا مانگنے میں بہت بھیک کے مزا
پر جب سے ہے سوال کا اس قوم پر مدار   منت سے عجز سے کبھی ملتا نہیں ٹکا
اُمید ہے کہ مانگنے کی چھوٹ جائے لت   گر چند روز اور رہا ان سے سابقا
آیا جواب سُن کے یہ اُس کا بہت پسند   کی آفریں اور اُس سے مخاطب نے یوں کہا
نیٹو ہیں جو کہ ملک میں تعلیم یافتہ   حق میں ترے مفید ہیں یہ اُن سے بھی سوا
انگریز اگرچہ ہندیوں کے حق میں ہیں بخیل   اہلِ وطن پہ اُن کی مگر جان ہے فدا
پر جو کہ دیسیوں میں ہیں تعلیم یافتہ   دل بھائیوں پہ بھی نہیں اُن کا پسیجتا
انگریز اتنے اجنبیوں سے نہیں نفور   جتنے کہ یہ عزیز عزیزوں سے ہیں خفا
اہلِ غرض پہ کاٹنے کو دوڑتے ہیں یہ   شائستگی کا زہر ہے جب سے انہیں چڑھا

اِسراف

ایک مسرف نے یہ ممسک سے کہا   کب تک اے ناداں یہ حُبِّ مال و زر
تو جو یوں رکھتا ہے دولت جوڑ جوڑ   ہے سدا دُنیا ہی میں رہنا مگر؟
ہنس کے ممسک نے کہا اے سادہ لوح   زر لٹانا رائیگاں اور اس قدر؟
آج ہی گویا (بنصیبِ دشمناں)
آپ کا دُنیا سے ہے عزمِ سفر

پاسِ نیکنامی

اے نیک نام شکر کر اللہ کا ادا
جس نے بنایا نیک تجھے کر کے نیک نام
ہوتا اگر نہ پاس تجھے نام نیک کا
پھر دیکھتے کہ کرتا ہے تو کیسے نیک کام
حاشا کہ تجھکو خوف خدا کا ہو اس قدر
جتنا کہ خوفِ طعنہ و تشنیعِ خاص و عام

غرورِ نیکنامی

گئی ہے حد سے گذر شیخ کی نکونامی
گمان بد کبھی اُس کی طرف نہیں جاتا
جو اُس کے عیب قسم سے بیاں کرے کوئی
خود اُس کو عیب کا اپنے یقیں نہیں آتا

کالے اور گورے کی صحت کاڈیکل امتحان

دو ملازم - ایک کالا اور گورا دوسرا
دوسرا پیدل - مگر پہلا سوار راہوار
تھے سول سرجن کی کوٹھی کی طرف دونو رواں
کیونکہ بیماری کی رخصت کے تھے دونو خواستگار
راہ میں دونو کی باہم ہوگئی کچھ ہشت مشت
کوکھ میں کالے کی اک ٹھُنگا دیا گورے نے مار
صدمہ پہنچا جس سے تلّی کو بہت مسکین کی
آکے گھوڑے سے لیا سائیں نے اُسکو اُتار
ٹھوک کر کالے کو گورے نے تو اپنی راہ لی
چوٹ کے صدمہ سے غش کالے کو آیا چند بار
آخرش کوٹھی پہ پہنچے جا کے دونو پیش و پس
ضارب اپنے پاؤں اور مضروب ڈولی میں سوار
ڈاکٹر نے آکے دونوں کی سُنی جب سرگذشت
تہ کو جا پہنچا سخن کی سُن کے قصہ ایک بار
دی سَنَد گورے کو لکھ - تھی جس میں تصدیقِ مرض
اور یہ لکھا تھا کہ سائل ہے بہت زار و نزار

یعنی اِک کالا نہ جس گورے کے ٹھکّے سے مرے
کر نہیں سکتا حکومت ہند پر وہ زینہار
اور کہا کالے سے تم کو مل نہیں سکتی سند
کیونکہ تم معلوم ہوتے ہو بظاہر جان دار
ایک کالا پٹ کے جو گورے سے فوراً مر نہ جائے
آئے بابا اُس کی بیماری کا کیونکر اعتبار

خودستائی

اے ذہنِ تیرہ وہ کون ہے جو خودستا نہیں
پر خودستائیوں کے ہیں عنواں جُدا جُدا
جو زیورِ خرد سے مُعرّا ہیں سادہ لوح
کرتے ہیں خوبیاں وہ بیاں اپنی برملا
جو اُن سے تیز ہوش ہیں سو سو طرح سے وہ
پردوں میں کرتے ہیں اسی مضموں کو ادا
کہتا ہے ایک کیسی حماقت ہوئی ہے آج
کمبل تھا ایک گھر میں سو سائل کو دیدیا
کہتا ہے دوسرا کہ گیا ہو کے منفعل
سائل کی ڈب میں میں نے دیا مال جب دکھا
پردہ میں زیرکی کے چھپاتا ہے بُخل یہ
اور بن کے بیوقوف جتاتا ہے وہ سخا
کچھ اِس لیے کہ ہم بھی اُنھیں میں سے ہوں شمار
اہلِ وطن کی اپنے بہت کرتے ہیں ثنا
کچھ اِس لیے کہ اپنا ہوا انصاف آشکار
کرتے ہیں اپنی قوم کی تنقیص جا بجا
کہتا ہے ایک "لاکھ نہ مانے بُرا کوئی
ہے عیب صاف گوئی کا ہم میں بہت بڑا"
کہتا ہے ایک "گُر ہے خوشامد کا اور ہی
پر چاہتے آدمی کو ہیں کہہ کہہ کے ہم بُرا"
دھوکا ہنر کا دے کے چھپاتا ہے عیب یہ
اور منہ سے ڈر دکھا کے دکھاتا ہے وہ صفا
چپ چاپ سُن رہا ہے کوئی اپنی خوبیاں
یعنی کہ یہ بیان ہے سب راست اور بجا
کہتا ہے اُس پہ کوئی کہ سب حسنِ ظن ہے یہ
اِک خاکسار کو جو دیا تم نے یوں بڑھا
قانع ہیں وہ اُنھیں پہ ہوئے وصف جو بیاں
اور چاہتا ہے یہ کہ ہو تعریف کچھ سوا

کہتا ہے زید- عمرو ہے شدّت سے سادہ لوح
گِنتا ہے سب کو نیک وہ اچھا ہو یا بُرا
کہتا ہے عمرو- زید بھی گنتا ہے عیب ہیں
بَد ہو کہ نیک اُس کی زباں سے نہیں بچا
یہ اِس کا اور وہ اِس کا بیاں کرکے کوئی عیب
ہر اِک ہے اپنی اپنی بڑائی نکالتا
غیبت- اُمید ہے کہ نہ ہوتی جہان میں
ہوتا اگر یہ خاک کا پُتلا نہ خودستا
حالی- جو پردے کھول رہے ہیں جہان کے
شاید کہ اس سے آپ کا ہوگا یہ مُدّعا
یعنی کہ لاکھ پردوں میں کوئی چھپائے عیب
اپنی[1] نظر سے رہ نہیں سکتا کبھی چھپا
القصّہ جس کو دیکھیے جاہل ہو یا حکیم
آزار میں خودی کے ہے بیچارہ مُبتلا

حملۂ نفس

ہم سمجھتے تھے کہ نفسِ دوں ہمارے بس میں ہے
گر کبھی حملہ پہ اُس کے غالب آ جاتے تھے ہم
پر جو دیکھا غور سے وہ بھبکیاں تھیں نفس کی
جن کو نادانی سے حملے اس کے ٹھیراتے تھے ہم
جب کیا حملہ دیے سب عقل نے ہتھیار ڈال
زور بازو پر ہمیشہ جس کے اتراتے تھے ہم

جس قوم میں افلاس ہو اُس میں بخل اتنا بدنما نہیں جتنا اِسراف

حالی سے کہا ہم نے کہ ہے اس کا سبب کیا
جب کرتے ہو تم کرتے ہو مُسرف کی مذمت
لیکن بخلاف آپ کے سب اگلے سخنور
جب کرتے تھے۔ کرتے تھے بخیلوں کو ملامت

---

[1] یعنی میری ۱۲

اِسراف بھی مذموم ہے پر بخل سے کمتر
ہے جس سے کہ انسان کو بالطبع عداوت
حالی نے کہا رو کے نہ پوچھو سبب اِس کا
یاروں کے لیے ہے یہ بیاں موجبِ رقت
وہ جانتے تھے قوم ہو جس وقت تو نگر
پھر اُس میں نہیں بخل سے بدتر کوئی خصلت
اور اب کہ نہ دولت ہی نہ ثروت ہی نہ اقبال
گھر گھر پہ ہی چھایا ہوا افلاس و فلاکت
ترغیب سخاوت کی ہے اب قوم کو ایسی
پرواز کی ہے چیونٹیوں کو جیسے ہدایت

رؤسائے عہد کی فیاضی

کی رئیسِ شہر کی تعریف یاروں نے بہت
بر سبیلِ تذکرہ باہم جو ذکر اُس کا چلا
بولے آج اُس کا نہیں مہماں نوازی میں نظیر
عاملانِ شہر مدعو اِسکے رہتے ہیں سدا
ضلع کے حکام کا ادنےٰ اشارہ چاہیے
پھر کوئی دیکھے سخاوت اُسکی اور بذل و عطا
یادگاریں جتنی ہیں اعیانِ دولت کی بنیں
اُنہیں صرف اُسکی رقم ہی سب کے چندے سے سوا
پالکی یا ویگنٹ ہے جو سواری اُسکے پاس
اہلکاروں کے لیے ہی وقف بے چون و چرا
کیا کلکٹر کیا کمشنر کیا سپاہی کیا عسس
اُسکی ہمت کے ہیں سب مداح بے روو ریا
جب یہ دیکھا مدح کا دفتر نہیں ہوتا تمام
جوڑ کر ہاتھ اُن سے حالی نے بصد منت کہا
عیب بھی اُس کا کوئی آخر کرو یارو بیاں
سنتے سنتے خوبیاں جی اپنا متلانے لگا

ایمان کی تعریف

فقیہِ شہر نے ایمان کی جو کی تعریف
تو دی چراغ سے اُس کو یہ آب و تاب مثال
کہا "فتیلہ اقرار باللساں ہے ضرور
جہاں ہو آتشِ تصدیق و روغنِ اعمال"

کہا کسی نے کہ نکلا ہے اِن دنوں اک تیل[1]
نہیں ضرور فتیلہ کا جس میں استعمال

برکتِ اتفاق

کہہ رہا تھا یہ اِک آزاد کہ ہیں جن میں ملاپ
دولت و بخت ہیں ہر حال میں اُن کے ہمراہ
نہ اُنھیں حاجتِ اعواں - نہ تلاشِ انصار
نہ اُنھیں خوفِ بداندیش نہ بیمِ بدخواہ
پر نہیں رابطہ جس قوم میں اور یکجہتی
اُس کی دُنیا ہے یہ سمجھو کہ گئی عزّت و جاہ
نہ ملاذ اُن کے لیے قلعہ نہ خندق نہ فصیل
نہ مفید اُن کے لیے فوج نہ لشکر نہ سپاہ
ایک مُلّا نے سُنا جب یہ سخن، فرمایا
تکیہ اور اِس قدر اسباب پہ کرنا ہے گناہ
اتفاق اور نفاق اصل میں کچھ چیز نہیں
دستِ قدرت کے ہیں سب ہاتھ سفید اور سیاہ
واں نہ مِلّت کی ضرورت ہے نہ کچھ پھوٹ کا ڈر
پڑ گئی فضل کی مولا کے جدھر ایک نگاہ
کہا آزاد نے سچ ہے کہ وہ دے ساتھ اگر
کر دیں افرادِ پراگندہ جماعت کو تباہ
پر مجھے خوب ہے اللہ کی عادت معلوم
اُس کو جب دیکھا ہے، دیکھا ہے جتھوں کے ہمراہ

بُعدِ صُوری مانعِ قُربِ معنوی نہیں ہے

حالی نے جو رہنے کے لیے شہر میں اک گھر
جا اپنے محلّہ سے کہیں دور بنایا
جب اہلِ محلّہ سے چلا ہو کے وہ رخصت
دل دردِ جدائی سے عزیزوں کا بھر آیا
ہمسایہ و احباب لگے کرنے سب افسوس
اِک دوست شکایت سے سخن لب پہ یہ لایا
بَلّی - کہ جو بے عقل ہے - دم دیتی ہے گھر پر
اتنی بھی محبّت تمھیں گھر سے نہیں آیا؟

---

[1] یعنی گردسن آئل جو بغیر بتی کے بھی جل سکتا ہے گویا مجیب کے نزدیک اقرار باللسان ایمان کی تعریف میں داخل نہیں ہے

حالی نے کہا "اُنس ہے چیز اور، وفا اور" بلی نے مزا پھل کا وفا کے نہیں پایا
اُس مہر و وفا کی نہیں بلی پہ پڑی چھینٹ کُتے نے ہے جس کا کہ سبق ہم کو پڑھایا
ہم غش ہیں مکینوں پہ وہ عاشق ہے مکاں کی گھر بھول گئے ہم پہ نہیں تم کو بھلایا
گھر دل میں ہو یاروں کا تو پھر گھر ہے برابر مشرق میں بنایا ہو کہ مغرب میں بسایا

ناصح مخلص اور اہلِ غرض میں تمیز

منصور نے یہ جعفر صادقؑ سے عرض کی محتاج ہے ہمیشہ سے ناصح کا ہر بشر
کرتے رہیں گر آپ کرم مجھ پہ گاہ گاہ ہوتا رہوں گا پند سے حضرت کی بہرہ ور
فرمایا ہوتے ہیں تری صحبت میں جو شریک لائیں گے وہ نہ حرفِ نصیحت زبان پر
اور جن سے ہے اُمیدِ نصیحت وہ بالیقیں صحبت میں بیٹھنے سے کریں گے تری حذر

خادم آقا کی خدمت میں کیوں گستاخ ہو جاتے ہیں

کہتے ہیں خدّام ماموں کے بہت گستاخ تھے ایک دن خادم کی گستاخی پہ ماموں نے کہا
کوئی آقا جبکہ خوش اخلاق ہوتا ہے بہت پیش خدمت اُس کے بد اخلاق ہوتے ہیں سدا
پر جو سچ پوچھو تو ہونا خادموں کا شوخ چشم ہے دلیل اس کی کہ ہے خود خُلق آقا کا بُرا
کھو دیا ہیبت کو اپنی جس نے اور تمکین کو اُس نے گویا ڈھا دیا رُکن رکیں اخلاق کا

خوشامد کرنے کی ضرورت

متوکّل کا تیر چڑیا پر ہو گیا اتفاق سے جو خطا

ابنِ حمدون ندیم تھا حاضر — کی خلیفہ کی مدح اور یہ کہا
”جن کو خلقِ خدا پہ شفقت ہے — خوں بہانا نہیں وہ رکھتے روا
جا نہ سکتی تھی بچ کے تیر سے وہ — تونے دی قصداً اُس کی جان بچا“
ابنِ حمدون نے کی یہ دانائی — کہ خوشامد سے یوں اُسے تھپکا
دور تھا ورنہ کیا خلیفہ سے — ہو کے اپنی خطا سے کھسیانا
جا پڑے کنجشک ابنِ حمدوں پر — تیر کا اپنے امتحاں کرتا
ابنِ حمدوں کی جان گو جاتی — دل تو ہوتا خلیفہ کا ٹھنڈا

رعیّت پر نااہل کو مسلّط کرنا

ہاروں نے کہا۔ مصر لگا ہاتھ جب اُسکے — فرعون کا تھا مصر ہی نے مغز جلایا
وہ خطۂ ملعون تھا یہی جس کی بدولت — تھا دل میں خدائی کا خیال اُسکے سمایا
میں بھی اُسے اُس باغی و طاغی کے علی الرغم — اِک بندۂ بے قدر کو بخشوں گا خدایا
کہتے ہیں خصیب ایک غلامِ حبشی تھا — جس پر نہ پڑا تھا خرد و ہوش کا سایا
کی سلطنت مصر کی باگ اُس کے حوالے — نااہل کے پنجہ میں اہالی کو پھنسایا
باڑی گئی بہہ ایک برس نیل کی رو میں — یہ حادثہ آ اُس کو کسانوں نے سنایا
فرمایا کہ روئی کی جگہ بوتے اگر اُون — ہوتا نہ یہ نقصان کہ جو تم نے اُٹھایا
ہارون نہ سمجھا کہ ودیعت ہے خدا کی — محکوم ہے جو میری رعایا و برایا
فرعون کی مانند اگر وہ بھی سمجھتا — اپنے کو خدا جس نے ہے عالم کو بنایا
جوکھوں میں نہ یوں ڈالتا مخلوق کو اپنی — اِک سفلۂ ناکس کی بنا اُس کو رعایا

رشک

ظاہرا مردوں کی طینت میں نہیں رشک اِس قدر
ہے طبیعت میں وہ جتنا عورتوں کی جاگزیں

ایک شہزادی کہ اکلوتی تھی جو ماں باپ کی
تخت شاہی پر ہوئی بعد از پدر مسند نشیں

سلطنت میں اُسکی تھا مردوں کو کُلّی اختیار
عورتیں اصلا دخیل اُسکی حکومت میں نہ تھیں

مرد ہی تھے اُسکے محرم - مرد ہی اُسکے مشیر
تھا نہ عورت کا پتہ دربار میں اُسکے کہیں

تخلیہ میں ایک دن جب چند حاضر تھے ندیم
ہنس کے فرمایا کہ اے دولت کے ارکانِ رکیں

مرد ہونے کے سبب تم سے نہیں مانوس میں
بلکہ ہے اُنس اسلیے تم سے کہ تم عورت نہیں

بات کی حُسنِ بیاں سے اُس نے دی صورت بدل
تاکہ کوئی سوئے ظن اُس پر نہ کر بیٹھے کہیں

ورنہ یوں کہتی کہ ہے عورت کی سیرت سے مجھے
اسلیے نفرت۔ کہ ہے مردونکی صورت دل نشیں

قانون

کہتے ہیں ہر فردِ انساں پر ہے فرض
ماننا قانون کا بعد از خدا

پر جو سچ پوچھو نہیں قانون میں
جان کچھ مکڑی کے جالے سے سوا

اس میں پھنس جاتے ہیں جو کم زور ہیں
اور ہلا سکتے نہیں کچھ دست و پا

پر اسے دیتے ہیں توڑ اک آن میں
جو سکت رکھتے ہیں ہاتھوں میں ذرا

حق میں کم زوروں کے ہے قانون وہ
اور نظر میں زورمندوں کی ہے لا

شادی قبل از بلوغ

جب تک نہ شاہ زادہ اٹھارہ سال کا ہو
تختِ پدر پہ اُس کو ممنوع ہے بٹھانا
قانون ہے بنایا یہ اُن مقننوں نے
عالم میں آج کل جو مانے ہوئے ہیں دانا
لیکن کریں نہ اُس کی قبل از بلوغ شادی
کہتے ہیں وہ عبث ہے قانون یہ بنانا
نزدیک اُن کے گویا بر رغمِ عقل و دانش
ہے کنگڈم سے آساں میڈم کو بس میں لانا

حرص

اثنائے وعظ میں ہے تکیہ کلام واعظ
قدرِ قلیل ہے سب مال و منالِ دنیا
گویا کہ حرص اُس کی اس سے بھی نہیں ہے۔
ہے جس قدر فراہم پاس اُس کے مالِ دنیا

امرا اور عقلا

جاتے ہیں اگر پاس امیروں کے خردمند
وہ جانتے ہیں جو کہ ہے جانے کی ضرورت
پر اپنی ضرورت سے خبردار نہیں ہیں
ملتے عقلا سے نہیں جو صاحبِ ثروت
بیمار کے محتاج ہیں جتنے کہ اطبّا
بیمار کو کچھ اِس سے سوا اُن کی ہے حاجت

عصمت بی بی از بے چادری

اے بینواؤ ہنستے ہو کیا منعموں پہ تم
اخلاق میں کچھ اُن کے اگر آگیا بگاڑ
تم زد سے نفس کی ہو جبھی تک بچے ہوئے
ہو جب تلک کہ پکڑے ہوئے مفلسی کی آڑ

اسباب جو کہ جمع ہیں منعم کے گرد و پیش گر تم کو ہوں نصیب تو دُنیا کو دو اُجاڑ

سچ کہاں ہے

دیکھنے ہوں تمھیں گر جھوٹ کے انبار لگے دیکھ لو جا کے خزانوں میں کتب خانوں کے
سچ کو تحریروں میں پاؤ گے نہ تقریروں میں سچ کہیں ہی تو وہ سینوں میں ہی انسانوں کے

اپنا الزام دوسروں پر تھوپنا

ٹھوٹ کاریگر سے جب کوئی بگڑ جاتا ہی کام اپنے اوزاروں کو وہ الزام دیتا ہی سدا
افسروں کا بھی یہی شیوہ ہے وقتِ بازپُرس اپنے ماتحتوں کے سر دیتے ہیں تھوپ اپنی خطا

خوشامد کے معنی

خوشامد کرتے ہیں آ آ کے جو لوگ تمھاری ہر دم اے اربابِ دولت
خوشامد پر نہ ان کی بھولنا تم وہ گویا تم کو کرتے ہیں ملامت
کہ جو ہم نے بیاں کیں خصلتیں نیک نہیں ان میں سے تم میں ایک خصلت

تدبیر قیام سلطنت

تدبیر یہ کہتی تھی کہ جو ملک ہو مفتوح واں پاؤں جمانے کے لیے تفرقہ ڈالو
اور عقل خلاف اُس کے تھی یہ مشورہ دیتی یہ حرفِ تُنک بھول کے منہ سے نہ نکالو
پر رائے نے فرمایا کہ جو کہتی ہے تدبیر مانو اُسے اور عقل کا کہنا بھی نہ ٹالو

کرنے کے ہیں جو کام وہ کرتے رہو لیکن
جو بات سُبک ہو اُسے منہ سے نہ نکالو

مرد اور عورت کی حکومت کا فرق

پوچھا کسی دانا سے سبب کیا ہے کہ اکثر
مردوں کی حکومت میں ہی ملکوں کی بُری گت
لیکن بخلاف اسکے۔ ہی عورت کا جہاں راج
واں ملک ہی سرسبز اور آباد رعیت
فرمایا کہ ہوتے ہیں جہاں مرد جہاندار
قبضہ میں ہی واں عورتوں کے دولت و مکنت
اور سر پہ ہے عورت کے جہاں افسر شاہی
سمجھو کہ ہے اُس ملک میں مردوں کی حکومت

مغرور کی پہچان

غرورِ زید کی کرتا ہے گر شکایت عمرو
تو سمجھو کرتا ہے اپنے غرور کا اقرار
جنھوں نے آپ کو سب سے سمجھ لیا ہے بڑا
بڑائی دیکھ نہیں سکتے غیر کی زنہار

کام اچّھا کرنا چاہیے نہ جلد

کام اچّھا کوئی بن آیا اگر انسان سے
اُس نے کی تاخیر اُس میں جس قدر اچّھا کیا
کب کیا کیوں کر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

گدائے مُبرم

اِک برہمن مورتی کے سامنے باصد نیاز
مانگتا تھا ہاتھ پھیلائے دُعا بیٹھا کہیں
آن نکلا بانوا اک مانگتا کھاتا اِدھر
دیکھ محویت برہمن کی گیا بس جم وہیں

دل میں آیا چھیڑ کر قائل برہمن کو کرے تا کہ پوجے کچھ نہ کچھ یاروں کو ہو کر شرمگیں
مورتی کے سامنے جب کر چکا وہ التجا بانوا بولا کہ ہے تو بھی عجب کوتاہ بیں
مورتی کچھ تجکو دے گی اور نہ دیسکتی ہے وہ ناحق اتنی اِلتجائیں اسکے آگے تونے کیں
ہنس کے برہمن نے کہا "ہے مانگنا بندہ کا کام دے۔ نہ دے وہ اس سے کچھ مطلب نہیں اپنے تئیں
ہم نہیں دیتے دھنی تم جیسے ڈھیٹوں کی طرح ہاتھ پھیلاتے ہیں لیکن پانو پھیلاتے نہیں

بے اعتدالی

تم اے خود پرستو طبیعت کے بندو ذرا وصف اپنے سنو کان دھر کے
نہیں کام کا تم کو اندازہ ہرگز جدھر ڈھل گئے ہو رہے بس اُدھر کے
جو گانے بجانے پہ آئی طبیعت تو چیخ اُٹھے دو دن میں ہمسائے گھر کے
جو مجرے میں بیٹھو تو اُٹھو نہ جب تک کہ اُٹھ جائیں ساتھی سب ایک ایک کر کے
اگر پل پڑے چوسر اور گنجفہ پر تو فرصت ملے شاید اب تم کو مر کے
پڑا مرغ بازی کا لپکا تو جانو کہ بس ٹھن گئے عزمِ جنگ تتر کے
چڑھا بھوت عشق و جوانی کا سر پر تو پھر گھاٹ کے آپ ہیں اور نہ گھر کے
جو ہے تم کو کھانے کا چسکا تو سمجھو کہ چھوڑیں گے اب آپ دوزخ کو بھر کے
جو پینے پہ آؤ تو پی جاؤ اتنی رہیں پانو کے ہوش جس میں نہ سر کے
جو کھانا تو بے حد جو پینا تو ات گت غرض یہ کہ سر کا رہیں پیٹ بھر کے

لہ یعنی پیٹ بھر کے احمق۔ احمق کا لفظ اکثر اس مقام پر حذف کر دیتے ہیں گویا مخاطب کے سوا کسی پر اس کی حماقت ظاہر کرنی نہیں چاہیے۔ ۱۲

طبیب اپنے بیماروں کے مرنے پر مغموم کیوں نہیں ہوتے

بشر کے صدمہ سے ہوتا ہے ہر بشر کو ملال
کہ ایک جڑ کی ہیں سب ٹہنیاں صغار و کبار
یہ صدمہ گر غلطی سے کسی کی پڑتا ہے
تو اور بھی اُسے دیتا ہے انفعال فشار
یہی سبب ہے کہ ہوتے نہیں طبیب ملول
جو چل بسے کوئی اُن کے علاج میں بیمار
وہ جانتے ہیں کہ تھپ جائیگی خطا ہم پر
کیا ملال کا اپنے گر اس جگہہ اظہار

اپنی ایک ایک خوبی کو بار بار ظاہر کرنا

گو آدمی کا حافظہ کیسا ہی ہو قوی
پر بھول چوک ہے بشریت کا مقتضا
ہوتا ہے اس سے کارِ نمایاں کوئی اگر
کرتا ہے بار بار بیاں اُس کو برملا
یہ تو وہ بھولتا نہیں ہرگز کہ چاہیے
ہر بار اپنی مدح کا پیرایہ اِک جدا
پر اتفاق سے نہیں رہتا یہ اُس کو یاد
یاروں سے ہیں بیان ابھی کر چکا ہوں کیا
بھولے نہ اپنی یاد پہ انساں کو چاہیے
آخر بشر کا خاصّہ ہے سہو اور خطا

فضول خرچی کا انجام

سرے پہ راہ کے بیٹھا تھا اِک گدائے ظریف
جہاں سے ہو کے گزرتے تھے سب صغیر و کبیر
ہر اِک سے ایک درم مانگتا تھا بے کم و بیش
سخی ہو اس میں کہ ممسک - غریب ہو کہ امیر
فضول خرچ تھا بستی میں ایک دولتمند
کہ جس کا تھا کوئی اسراف میں نہ شبہ و نظیر
ہوا جو ایک دن اُس راہ سے گزر اُس کا
درم اک اُس نے بھی چاہا کہ کیجئے نذرِ فقیر

کہا فقیر نے گو اپنی یہ نہیں عادت
کہ لیں درم سے زیادہ کسی سے ایک شعیر
یہ لوں گا آپ سے میں پانچ کم سے کم دینار
کہ دولت آپ کی پاتا ہوں میں زوال پذیر
یہی اَللّے تللّے رہے تو آپ کو بھی
ہماری طرح سے ہونا ہے ایک روز فقیر
سو وقت ہے یہی لینے کا خود بدولت سے
دکھائے دیکھیے پھر اس کے بعد کیا تقدیر

اختلافِ مذاہب رفع نہیں ہو سکتا

غیر ممکن ہے کہ اُٹھ جائے دلیل و بحث سے
جو چلا آتا ہے باہم اہلِ مذہب میں خلاف
ہو نہیں سکتا مطابق جبکہ دو گھڑیوں کا وقت
رفع ہو سکتے ہیں پھر کیوں کر ہزاروں اختلاف

انسان جو اشرف المخلوقات ہے سب سے زیادہ موردِ آفات ہے

دل پہ جو کیفیتیں ہیں ناگوار
دو ہیں اُن میں سے نہایت جانگزا
ایک فکر اُس آنے والے وقت کی
شک نہیں ہے جس کے آنے میں ذرا
دوسرے چوٹیں زبانِ خلق کی
زخم جن کا زخم سے ہے تلوار کا
اور بھی حیوانِ ناطق کے لیے
ہیں بہت سی زحمتیں اِن کے سوا
پر گدھے اور اور حیوانات سب
رہتے ہیں دور اِن گزندوں سے سوا
کیسا اِن آلام سے رہتا بچت
اشرف المخلوق اگر ہوتا گدھا

چنڈو بازی کا انجام

ایک چنڈوالے سے چنڈو کے وہ تھا ہوش میں جب
پوچھا ناصح نے کہ اس کام کا آخر انجام
بولا انجام وہی جو کہ ہے سب کو معلوم
زندگانی کو وداع اور جوانی کو سلام

آنکھ میں اپنے پرائے کے ٹھہرنا بے قدر
شہر کے کوچہ و بازار میں رہنا بدنام

ہم پہ آئینہ ہے جو حال ہے ہونا اپنا
نفس سرکش کے مگر ہاتھ میں ہے اپنی زمام

کہا ناصح نے کہ انجام ہو معلوم اگر
لے نہ اس زہر ہلاہل کا کوئی بھول کے نام

یہ تو کہتے ہو کہ انجام برا ہے لیکن
یہ بتاؤ کہ برا ہوتا ہے کیسا انجام

برے انجام کی تب ہوگی حقیقت روشن
برے انجام سے جب آکے پڑیگا خود کام

مرنے والے ہی کو ہے موت کی لذت معلوم
گو کہ رکھتے ہیں یقیں موت کا سب پختہ و خام

قوم کی پاسداری

اِک مسلماں حامیِ انگریزوں تھا یوں نکتہ چیں
پاس اِن لوگوں کو اپنی قوم کا ہے کِس قدر

چاہتے ہیں۔ نفع پہنچے اپنے اہلِ ملک کو
گو کہ اُن کے نفع میں ہو ایک عالم کا ضرر

کارخانہ کا یہ رہا جس کے کبھی چاقو نہ لیں
اس کا ہو بیچارہ ہندی بیچنے والا اگر

خوردنی چیزیں جو یاں سے لینی پڑتی ہیں اُنھیں
آئیں لندن سے منگائیں بس چلے اِن کا اگر

الغرض اہلِ وطن کی پاسداری کو یہ لوگ
جانتے ہیں دین و ایماں اپنا قصہ مختصر

سُن کے حالی نے کہا۔ ہے حصر انگریزوں کیا
ایک سے ہے ایک قوم اس عیب میں آلودہ تر

ہیں محبت میں سب اندھے اپنی اپنی قوم کے
یہ وہ خصلت ہے کہ مجبور اِس پہ ہے طبعِ بشر

مکھیاں جیتی نگل جاتے ہیں پاسِ قوم میں
اچھے اچھے راستباز اور حق پسند اور دادگر

ہاں۔ بَری اِس عیب سے دیکھے اِس دنیا میں ہم
چشمِ بد دور اُمّتِ مرحوم اے جانِ پدر

اور قوموں سے انھیں لوگوں کو ہے یہ امتیاز
حملہ جب کرتے ہیں یہ کرتے ہیں اپنی فوج پر

ہوگا خوف ایسا نہ دشمن سے کسی دشمن کو یاں
جس قدر ہے ان سے اپنوں اور بیگانوں کو خطر

غزلیات قدیم وجدید

چونکہ بہت سی ردیفیں قدیم غزلیات میں اور بہت سی جدید غزلیات میں نہیں تھیں اس لیے ہر ایک ردیف میں دونوں قسم کی غزلیں ملا جلا کر لکھدی گئی ہیں اور تمیز کے لیے ہر قدیم غزل کے شروع میں حاشیہ پر حرف ق لکھدیا گیا ہے۔ تاکہ ناظرین اندازہ کرسکیں کہ قدیم وجدید غزل میں کیا فرق ہے۔

(1)

قبضہ ہو دلوں پر کیا اور اس سے سوا تیرا
اِک بندۂ نافرماں ہے حمد سرا تیرا

گو سب سے مقدم ہے حق تیرا ادا کرنا
بندے سے مگر ہوگا حق کیوں کہ ادا تیرا

محرم بھی ہے ایسا ہی جیسا کہ ہے نامحرم
کچھ کہہ نہ سکا جس پر یاں بھید کھُلا تیرا

بٹتا نہیں فقروں میں یاں خلعتِ سلطانی
کملی میں مگن اپنی رہتا ہے گدا تیرا

عظمت تری مانے بِن کچھ بَن نہیں آتی یاں
قطعہ ہیں خیرہ و سرکش بھی دم بھرتے سدا تیرا

تو ہی نظر آتا ہے ہر شے پہ محیط اُن کو
جو رنج و مصیبت میں کہتے ہیں گلا تیرا

نشہ میں وہ احساں کے سرشار ہیں اور بیخود
جو شکر نہیں کرتے نعمت پہ ادا تیرا

سمجھا ہے پرے تجکو ادراک کی سرحد سے
جس قوم نے رکھا ہے انکار روا تیرا

طاعت میں ادب تیرا عصیاں سے ہی گو بڑھکر
عصیاں میں ہے طاعت سے اقرار سوا تیرا

آفاق میں پھیلیگی کب تک نہ مہک تیری
گھر گھر لیے پھرتی ہے پیغام صبا عہ تیرا

عہ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف الا ان للّٰہ نفحاتٍ فی الدھر الا فتعرضوا لہا م

یعنی خدا کی خوشبوئیں زمانہ میں پھیلی ہوئی ہیں سو اُن کا سراغ لگالو اور اُنکو راہ پر نہ جانے دو ۱۲

ہر بول ترا دل سے ٹکرا کے گزرتا ہے
کچھ رنگِ بیاں حالیؔ ہے سب سے جُدا تیرا

(۲)

کامل ہے جو ازل سے وہ ہے کمال تیرا
باقی جو ہے اَبد تک وہ ہے جلال تیرا
ہے عارفوں کو حیرت اور منکروں کو سکتہ
ہر دل پہ چھا رہا ہے رُعبِ جمال تیرا
کاوش میں ہے الٰہی دُگدا میں ہے طبیعی
جو حل ہوا نہ ہوگا وہ ہے سوال تیرا
چھوٹے ہوئے ہیں گو جی۔ پر دل بندھے ہوئے ہیں
ملنے سے بھی سوا ہے چُھٹنا محال تیرا
گو حکم تیرے لاکھوں یاں ٹالتے رہے ہیں
لیکن ٹلا نہ ہرگز دل سے خیال تیرا
پھندے سے تیرے کیونکر جائے نکل کے کوئی
پھیلا ہوا ہے ہر سو عالم میں جال تیرا
اُن کی نظر میں شوکت جچتی نہیں کسی کی
آنکھوں میں بس رہا ہے جن کی جلال تیرا
دل ہو کہ جان تجھ سے کیوں کر عزیز رکھیے
دل ہے سو چیز تیری۔ جاں ہے سو مال تیرا
ہے پورزال سے دل اُس کا قوی زیادہ
رکھتی ہے آسرا یاں جو پیر زال تیرا
ہے پاس دوستوں کے تیری یہی نشانی
یارب کبھی نہ پائے زخم اندمال تیرا
بیگانگی میں حالیؔ یہ رنگ آشنائی
سُن سُن کے سر دھنیں گے قال اہلِ حال تیرا

(۳)

رَبڑ میں دشتِ جنوں کی تیرے عجب مزا خوشگوار دیکھا
نہ اِس سفر میں تکان دیکھی نہ اس نشے میں خمار دیکھا
نہ جی دُکھائی سے تیری چھوٹے نہ بے نیازی سے آس ٹوٹے
رہے سدا نامراد جو یاں اُنھیں بھی اُمّید وار دیکھا

رخِ جہاں سوز تیرا دیکھا نظارہ افسردہ جس چمن میں
نہ بلبل و گل میں واں تعلق نہ سرو و قمری میں پیار دیکھا
سوارِ محمل کی جستجو میں ہزاروں دشتِ طلب میں دوڑے
نہ محمل آیا نظر نہ ناقہ فقط کچھ اٹھتا غبار دیکھا
جو لاکھ میں ایک پر کہیں کچھ کھلا بھی قسمت سے بھید تیرا
ملا نہ کھوج اُس کا پھر کسی کو ہزار ڈھونڈا ہزار دیکھا
لگن میں تیری نکل گئے جو نہ جھجکے دریائے پُر خطر سے
گئے وہ کود آنکھ بند کرکے نہ وار دیکھا نہ پار دیکھا
بچے ہوئے کاہشوں سے یاں کی وہی ہیں جو تیرے ہو رہے ہیں
وگرنہ زخموں سے حادثوں کے ہر ایک سینہ فگار دیکھا
چمن میں بھولے سے جا بھی نکلے اگر کبھی داغدار تیرے
گُل اُن کی نظروں میں چبھتے دیکھا کھٹکتے آنکھوں میں خار دیکھا
خبر نہیں یہ کہ کیا ہے۔ کیسا ہے۔ کون ہے۔ اور تو کہاں ہے
پہ اپنے میں اور تجھ میں ہم نے علاقہ اِک استوار دیکھا
سلوک ہیں تیرے سب سے یکساں وہ گبر و ترسا ہو یا مسلماں
نہ اِن سے کچھ تیرا بیر پایا نہ اُن سے کچھ تیرا پیار دیکھا
سپر بھی دی تو نے تیغ بھی دی مگر دیے ہاتھ باندھ سب کے
جنھیں تھا یاں اختیار سب کچھ اُنھیں بھی بے اختیار دیکھا

بشر سے کچھ ہو سکے نہ حالی تو ایسے جینے سے فائدہ کیا
ہمیشہ بیکار تجھکو پایا کبھی نہ سرگرم کار دیکھا

(۴)

پردہ ہو لاکھ کینۂ شمر و یزید کا   چھپتا نہیں جلال تمہارے شہید کا
مضموں ہی نقش دل میں لدینا مزید کا   کونین سے بھریگا نہ دامن اُمید کا
قفلِ درِ مُراد سب اِکبارہ کُھل گئے   چھوڑا جب آرزو نے بھروسا کلید کا
دیکھا ہے ہم نے عالمِ رحمت کو غور سے   ہے شش جہت میں قحط دلِ ناامید کا
شرمِ کرم کی ہیں یہی گر پردہ داریاں   انجام ایک ہوگا شقی و سعید کا
ہے نزدبانِ جذبۂ توفیق درمیاں   یاں امتیاز کیا ہے قریب و بعید کا
ہے آسماں پہ تیرے جگرخوار کا دماغ   خونِ جگر میں نشہ ہے جام نبید کا
تسکیں نہیں مشاہدۂ گاہ گاہ سے   یارب یہ روزہ دار ہے مشتاق عید کا
دوزخ ہی گر وسیع تو رحمت وسیع تر   لاتقنطوا جواب ہے ھل من مزید کا

حالی کی ہیں اگر یہی شیوا بیانیاں
لیگا نہ کوئی نام ظہیر و رشید کا

نعت

یا ملکی الصفات یا بشری القوےٰ   فیک دلیلٌ علےٰ انک خیر الورےٰ
تجھ سے ہوئی زندہ خلق جیسے کہ بارانسے خاک   خلقک خصب الزماں بعثک محیا الورےٰ
دعوئ روشن ترا ثابت ہے بے بیّنہ   صورت و سیرت تری صدق پہ تیرے گوا
قال ترا اور حال نشۂ وحدت میں چور   اوڑھنا تیرا خدا اور بچھونا خدا

غیب سے بھیجا تجھے ٹاپتا پھرتا تھا جب
دشت میں بھٹکا ہوا قافلہ بے رہنما
اُٹھا ہدایت کو تو عین ضرورت کے وقت
جیسے کہ ہنگام قحط قبلہ سے اُٹھے گھٹا
شانِ رسالت کی تھی تیری جبیں سے عیاں
گود سے دایہ ابھی کر نہ چکی تھی جدا
گلۂ بنی سعد کا جب کہ چراتا تھا تو
گلۂ آدم تجھے سونپ چکی تھی قضا
دوڑ پڑے سوئے حق کاٹ کے سب بیڑیاں
اُمیوں کے جب پڑی کان میں تیری صدا
راہب و قسیس و حبر رہ گئے دل تھام کر
دیکھ کے تیرا قدم ہمقدم انبیا
خاک تھی جس ملک کی مزرعِ شرّ و فساد
تو نے اُسی کو دیا ارضِ مقدس بنا
تو نے تحمل کیا قوم کا غلبہ تھا جب
جب ہوئی مغلوب قوم تو نے ترحم کیا
چھوڑ گئے تھے سلف کام ادھورے بہت
تو نے کیا دام دام قرض سب ان کا ادا
تو نے کیا سرّ حق عارف و عامی پہ فاش
ایک کو سمجھا دیا ایک کو دِکھلا دیا
چوٹ سے حق کی رہا دل نہ اچھوتا کوئی
ایک کو چرکا دیا ایک کو گھائل کیا
حجتِ حق کر چکا دین ترا جب تمام
پھر نہ کسی دین کا رنگ جہاں میں جما
دیر[1] ہوئے بے چراغ اور صلوات یہود
شرک ہوا مضمحل اور کہانت ہبا
بجھ گئے آتش کدے بیٹھ گئے بتکدے
ہوگئی تثلیث مات اور ثنویت[2] فنا
اُٹھے بہت مدّعی جیسے کہ ساون میں گھاس
مزبلہ پر چند روز پاتی ہے نشو و نما
غیرتِ حق نے مگر جلد لیا انتقام
مل گئے اُٹھ اُٹھ کے سب خاک میں اہلِ ہوا

---

[1] راہبوں کا کلیسا۔ صلوات۔ یہودیوں کا کلیسا۔ ہبا۔ ضیا۔ ناچیز ۱۲

[2] مجوسی جو دو خدا ایک خالقِ خیر اور ایک خالقِ شر یعنی یزداں اور اہرمن کو مانتے ہیں۔ اس عقیدے کو ثنویت کہتے ہیں۔ ۱۲

رہ گیا نام سجاح[1] کذب میں ضرب المثل / اسود و ابنِ کثیر خوار ہوئے برملا
سلسلۂ انبیا ختم نہ ہوتا اگر / حق کی حقیقت سے تو پردہ نہ دیتا اٹھا
آتے ہی چشمہ دیا تو نے کنویں سے نکال / جس کو چلے آتے تھے کھودتے سب انبیا
بس نہ رہا اشتباہ اب حق و باطل میں کچھ / بھیج چکا تیرے ہاتھ ملّتِ بیضا خدا
تجھ پہ صلوٰۃ و سلام ربِّ سمٰوٰات سے
روز و شب و صبح و شام قدرِ رملِ[2] و حصے

اے عشق تو نے اکثر قوموں کو کھا کے چھوڑا / جس گھر سے سر اٹھایا اس کو بٹھا کے چھوڑا
ابرار تجھ سے ترساں احرار تجھ سے لرزاں / جو زد پہ تیری آیا اس کو گرا کے چھوڑا
راوں کے راج چھینے شاہوں کے تاج چھینے / گردن کشوں کو اکثر نیچا دکھا کے چھوڑا
کیا منعموں کی دولت کیا زاہدوں کا تقویٰ / جو گنج تو نے تاکا اس کو لٹا کے چھوڑا
جس رہ گذر میں بیٹھا تو غولِ راہ بن کر / صنعاں سے راست رو کو رستہ بھلا کے چھوڑا
فرہاد کوہ کن کی لی تو نے جان شیریں / اور قیس عامری کو مجنوں بنا کے چھوڑا
یعقوب سے بشر کو دی تو نے ناصبوری / یوسف سے پارسا پر بہتاں لگا کے چھوڑا
لاگ اور لگاؤ دونوں ہیں دلگداز تیرے / پتھر کے دل تھے جن کے ان کو رلا کے چھوڑا
عقل و خرد نے تجھ سے کچھ چپقلش جہاں کی / عقل و خرد کا تو نے خاکا اڑا کے چھوڑا

---

[1] سجاح ایک عورت مدعیّہ نبوت کا نام ہے جس کا کذب عرب میں ضرب المثل ہے چنانچہ کہتے ہیں ھو الکذب من سجاح اور اسود عنسی اور مسیلمہ جس کی کنیت ابن کثیر ہے یہ دونوں بھی مدعی نبوت تھے۔ آخر کار قتل کئے گئے۔ ۱۲

[2] رمل: ریت۔ حصے: سنگریزے۔ ۱۲

علم و ادب رہے ہیں دبیلے تیری ہمیشہ   ہر معرکہ میں تونے ان کو دلا[لہ] کے چھوڑا
افسانہ تیرا رنگیں روداد تیری دلکش   شعر و سخن کو تونے جادو بنا کے چھوڑا

اِک دسترس سے تیری حالیؔ بچا ہوا تھا
اُسکے بھی دل پہ آخر چرکا لگا کے چھوڑا

۶
دیکھ اے اُمید کیجو ہم سے نہ تو کنارا   تیرا ہی رہ گیا ہے لے دیکے اِک سہارا
یوں بے سبب زمانہ پھرتا نہیں کسی سے   اے آسماں کچھ اس میں تیرا بھی ہے اشارا
مے خانہ کی خرابی جی دیکھ کر بھر آیا   مدّت کے بعد کل واں جا نکلے تھے قضارا
اِک شخص کو توقع بخشش کی بے عمل ہے   اے زاہدو تمھارا ہے اِس میں کیا اجارا
دنیا کے خرخشوں سے چیخ اُٹھتے تھے ہم اوّل   آخر کو رفتہ رفتہ سب ہو گئے گوارا
توفیق نے ہمیشہ لی تنت پہ خبر یہاں   جب ناؤ ڈگمگائی پاس آ گیا کنارا
انصاف سے جو دیکھا نکلے وہ عیب سارے   جتنے ہنر تھے اپنے عالم میں آشکارا
افسوس اہلِ دیں بھی مانند اہلِ دنیا   خود کام و خود نما ہیں خود بیں ہیں اور خود آرا
اُمت کو چھانٹ ڈالا کافر بنا بنا کر   اِسلام ہے فقیہو! ممنوں بہت تمھارا
کیا پوچھتے ہو کیوں کر سب نکتہ چیں ہوئے چپ   سب کچھ کہا اُنھوں نے پر ہم نے دم نہ مارا

حالیؔ سے کام ہے یہاں فعلوں سے اُسکے کیا کام
اچھا ہے یا بُرا ہے پھر یار ہے ہمارا

۷
رونا نہ ہوگا حالیؔ شاید یہ کم تمھارا   جب دیکھو آنسوؤں سے دامن ہے نم تمھارا
اُلفت میں دمبدم کچھ لذّت ہی بڑھتی جاتی   چھوڑے گا کھا کے شاید عاشق کو غم تمھارا

[لہ] دلانا۔ کشتی دلانا یعنی پچھاڑنا۔ اکثر کشتی کا لفظ حذف کرکے صرف دلانا بولتے ہیں۔ ۱۲

عاقل ہیں شہر میں کم ناداں بہت ہیں واعظ
ہے مصلحت کہ اکثر بھرتے ہیں دم تمہارا
دل جو نہیں کوئی یاں حیف ای صنم پرستو
دلکش بہت تھا ورنہ بیت الصنم تمہارا
گاہک کی قدر سے کچھ قیمت نہ پاؤ گے تم
اپنی نظر میں ہوگا گر وزن کم تمہارا
دشتِ طلب کے رستے طے ہوگئے کِس طرح تم
آتا نہیں سمجھ میں کچھ پیچ و خم تمہارا

۸

دو بینواؤں کو بھی کچھ جم کے جانشینو
بس جام جم ہمارا اور مُلکِ جم تمھارا
روسی ہوں یا تتاری ہم کو ستائیں گے کیا
دیکھا ہے ہم نے برسوں لطف و کرم تمھارا
کھولی ہیں تم نے آنکھیں اے حادثو ہماری
احسان یہ نہ ہرگز بھولیں گے ہم تمھارا
ہوتے ہی تم تو پیدل کچھ رہروے سوارہ
ہے لاکھ لاکھ من کا اِک اِک قدم تمھارا
رستے میں گر نہ ٹھیرے تو تم بھی جا ملوگے
گذرا ابھی ہے یہاں سے خیل و حشم تمھارا
پھرتے اِدھر اُدھر ہو کس کی تلاش میں تم
گم ہے تمھیں میں یارو باغِ ارم تمھارا
جادو رقم تو مانیں ہم دل سے تم کو حالی
کچھ کرکے بھی دکھائے زورِ قلم تمھارا

۹

وہ دل ہے شگفتہ نہ وہ بازو ہیں توانا
پہنچا ہی بس اب کوچ کا تم سمجھو زمانا
خود مہرِ وطن سے ہے وداع اب کے سفر میں
جانا ہے وہاں پھر کے جہاں سے نہیں آنا
دِلّی سے نکلتے ہی ہوا جینے سے جی سیر
گویا نہ رہا اب کہیں دنیا میں ٹھکانا
یارب طلب وصل ہو یا ہو طرب وصل
جس دن کہ یہ دونوں نہوں وہ دن نہ دکھانا
دنیا کی حقیقت نہیں جز حسرت و حرماں
چھل بل میں تم اِس زالِ فسونگر کی نہ آنا
افسوس کہ غفلت میں کٹا عہدِ جوانی
تھا آبِ بقا گھر میں مگر ہم نے نہ جانا

یاروں کو ہمیں دیکھ کے عبرت نہیں ہوتی   اب واقعہ سب اپنا پڑا ہم کو سُنانا
دنیا میں اگر ہے بھی فراغت کا کوئی دِن   وہ دن ہے کہ جس دن ہے اسے چھوڑ کے جانا
لی ہوش میں آنے کی جو ساقی سے اِجازت   فرمایا خبردار کہ نازک ہے زمانا
ڈھارس سی کچھ اے ہمقدمو۔ تم سے بندھی ہے
حالی کو کہیں راہ میں تم چھوڑ نہ جانا

(۱۰)

جہاں میں حالی کسی پہ اپنے سوا بھروسا نہ کیجیے گا
یہ بھید ہے اپنی زندگی کا بس اس کا چرچا نہ کیجیے گا
جو لاکھ غیروں کا غیر کوئی۔ نہ جاننا اُس کو غیر ہرگز
جو اپنا سایہ بھی ہو تو اُس کو تصوّر اپنا نہ کیجیے گا
سُنا ہے صوفی کا قول ہے یہ کہ ہے طریقت میں کفر دعوے
یہ کہدو۔ دعویٰ بہت بڑا ہے پھر ایسا دعویٰ نہ کیجیے گا
اِسی میں ہے خیر حضرتِ دل کہ یار بھولا ہوا ہے ہم کو
کرے وہ یاد۔ اس کی بھول کر بھی۔ کبھی تمنّا نہ کیجیے گا
کہے اگر کوئی تم کو واعظ! کہ کہتے کچھ اور کرتے کچھ ہو
زمانہ کی خو ہے نکتہ چینی کچھ اِس کی پروا نہ کیجیے گا
کمال ہے ضدِّ بے کمالی۔ نہیں ملاپ اِن میں حرف گیرو!
جو ہم پہ کچھ چوٹ کیجیے گا تو آپ بے جا نہ کیجیے گا
لگاؤ تم میں نہ لاگ زاہد نہ دردِ اُلفت کی آگ زاہد
پھر اور کیا کیجیے گا آخر جو ترکِ دنیا نہ کیجیے گا

تمھارا تھا دوستدار حالی اور اپنے بیگانہ کا رضاجو
سلوک اس سے کیے یہ تم نے تو ہم سے کیا کیا نہ کیجیے گا

ہو عزم دیر شاید کعبہ سے پھر کر اپنا
آتا ہے دور ہی سے ہم کو نظر گھر اپنا

قیدِ خرد میں رہتے آتے نہیں نظر ہم
وحشت رہیگی دل کی دکھلا کے جوہر اپنا

پیر مغاں سے ہو کر تب سرخرو ملیں گے
فضل و ہنر کا ہوگا جب چاک محضر اپنا

بیگانہ وش ہے گر وہ تو ہی ہمارے ڈھب کا
ایسوں ہی سے نبھا ہے یارانہ اکثر اپنا

عصمت پہ اپنی تھی خود فطرت گواہ اپنی
کر بیٹھے اپنے ہاتھوں ہم چاک محضر اپنا

کچھ کذب و افترا ہے کچھ کذبِ حق نما ہے
یہ ہے بضاعت اپنی اور یہ ہے دفتر اپنا

غیروں کو لیں گے آخر اپنا بنا کے کیا ہم
اپنوں ہی سے ہے حالی کچھ دل مکدّر اپنا

معنی کا تم نے حالی دریا اگر بہایا
یہ تو بتائیں حضرت کچھ کر کے بھی دکھایا

اے بانگ طبل شاہی دن ہو گیا جب آخر
خواب گراں سے تو نے ناحق ہمیں جگایا

تھا ہوش یادِ گل کا دورِ خزاں میں کس کو
اے عندلیب نالاں یہ تو نے گل کھلایا

ویراں ہے باغ تس پر پھولی نہیں سماتی
مژدہ صبا نے یارب بلبل کو کیا سنایا

اے عشق دل کو رکھا دنیا کا اور نہ دیں کا
گھر ہی بگاڑ ڈالا تو نے بنا بنایا

ڈرتے رہیں گے اب ہم بے جرم بھی سزا سے
احسان اس کا جس نے ناحق ہمیں ستایا

واعظ کی حجتوں سے قائل تو ہو گئے ہم
کوئی جواب شافی پر اس سے بن نہ آیا

آیا نہ تھا کبھی یہاں گویا قدم خزاں کا
دو دن میں یوں پلٹ دی کس نے چمن کی کایا

تقلید قوم ہی پر گر ہے مدار تحسیں
تو ہم نے دوستوں کی تحسیں سے ہاتھ اٹھایا

دیکھا تو کچھ نظر میں حالیؔ جچا نہ اپنی
جو جو گماں تھے ہم کو اُن کا نشاں نہ پایا

نفس دعویٰ بے گناہی کا سدا کرتا رہا — گرچہ اُترے جی سے دل اکثر ابا کرتا رہا
حق نے احساں میں کی اور میں نے کفراں میں کمی — وہ عطا کرتا رہا اور میں خطا کرتا رہا
چوریوں سے دیدۂ دل کی نہ شرمایا کبھی — چُپکے چُپکے نفس خائن کا کہا کرتا رہا
طاعتوں کی زد سے بچ بچ کر چلا راہِ خطا — وار اُن کا اس لیے اکثر خطا کرتا رہا
نفس میں جو ناروا خواہش ہوئی پیدا کبھی — اُس کو حیلے دل سے گھڑ گھڑ کر روا کرتا رہا
مُنہ نہ دیکھیں دوست پھر میرا اگر جانیں کہ میں — اُن سے کیا کہتا رہا اور آپ کیا کرتا رہا
تھا نہ استحقاق تحسیں پر سُنی تحسیں سدا — حق ہے جو دوں ہمتی کا وہ ادا کرتا رہا
شہرت اپنی جس قدر بڑھتی گئی آفاق میں — کبر نفس اتنا ہی یہاں نشو و نما کرتا رہا

ایک عالم سے وفا کی تو نے اے حالیؔ مگر
نفس پر اپنے سدا ظالم جفا کرتا رہا

کہیں الہام منوانا پڑے گا قطعہ — کہیں کشف اپنا جتلانا پڑے گا
نہ ہو صوفی صفا گو تجھ میں لیکن ۲ — کرشمہ کوئی دکھلانا پڑے گا
نصیحت بے اثر ہے گر نہ ہو درد — یہ گُر ناصح کو بتلانا پڑے گا
جنھیں ہو جھوٹ کو سچ کر دکھانا — اُنھیں سچّوں کو جھٹلانا پڑے گا
عوام الناس کا ہو گا جنھیں مُنھ — اُنھیں خاصوں پہ مُنھ آنا پڑے گا
رہے وصفِ جناں کی مشق واعظ — تمھیں بچّوں کو پھسلانا پڑے گا
سخن میں پیروی کی گر سلف کی — اُنھیں باتوں کو دُہرانا پڑے گا

تعلّق کا ہے پھندا پیچ در پیچ قطعہ یہ عقدہ ہم کو سلجھانا پڑے گا
بہت یاں ٹھوکریں کھائی ہیں ہمنے ۲ بس اب دنیا کو ٹھکرانا پڑے گا
نہیں بو اُنس کی اِس غم کدے میں ۳ کہیں دِل جا کے بہلانا پڑے گا
دِل اب صحبت سے کوسوں بھاگتا ہے ۴ ہمیں یاروں سے شرمانا پڑے گا
زمانہ کر رہا ہے قطع پیوند ۵ وفا سے ہم کو پچھتانا پڑے گا
جو منصوبے ہیں یہ حالی تو شاید ارادہ فسخ فرمانا پڑے گا
بشر پہلو میں دل رکھتا ہے جب تک
اُسے دُنیا کا غم کھانا پڑے گا

سخن پر ہمیں اپنے رونا پڑے گا یہ دفتر کسی دن ڈبونا پڑے گا
عزیزو کہاں تک یہ آتش مزاجی تمھیں جلد تر خاک ہونا پڑے گا
رہا دوستی پر نہ تکیہ کسی کی بس اب دل سے تجکو نکو دھونا پڑے گا
بن آئیگی ہرگز نہ یہاں کچھ کیے بن جو کچھ کاٹنا ہے تو بونا پڑے گا
ہوئے تم نہ سیدھے جوانی میں حالی
مگر اب مری جان ہونا پڑے گا

کب تک اے ابرِ کرم ترسائے گا مینھ بھی رحمت کا کبھی برسائے گا
پھل کچھ اے نخلِ وفا تجھ میں نہیں جو لگائے گا تجھے پچھتائے گا
دوست کا آیا ہی سمجھو اب پیام آج اگر آیا نہیں کل آئے گا
ذوق سب جاتے رہے جز ذوقِ درد اِک یہ لپکا دیکھیے کب جائے گا
واعظ آتا ہے تو آنے دو اُسے قطعہ پر مزا آنے کا یاں کیا پائے گا

آئے گا اور ہم کو شرمائے گا مفت ۲ اور خود شرمندہ ہو کر جائے گا
عیب سے خالی نہ واعظ ہے نہ ہم ۳ ہم پہ منھ آئے گا منھ کی کھائے گا
دل کے تیور ہی کہے دیتے تھے صاف رنگ یہ دیوانہ اک دن لائے گا
باغ و صحرا میں رہے جو تنگ دل جی قفس میں اُس کا کیا گھبرائے گا
رنگ گردوں کا ہے کچھ بدلا ہوا قطعہ شعبدہ تازہ کوئی دکھلائے گا
ابر و برق آئے ہیں دونوں ساتھ ساتھ ۲ دیکھیے برسے[لہ] گا یا برسائے گا
مشکلوں کی جس کو ہے حالی خبر
مشکلیں آساں وہی فرمائے گا

واں اگر جائیں تو لے کر جائیں کیا منھ اُسے ہم جا کے یہ دکھلائیں کیا
دل میں ہے باقی وہی حرص گناہ پھر کیے سے اپنے ہم پچھتائیں کیا
آؤ لیں اُس کو ہمیں جا کر منا اُس کی بے پروائیوں پر جائیں کیا
دل کو مسجد سے نہ مندر سے ہے اُنس ایسے وحشی کو کہیں بہلائیں کیا
جانتا دنیا کو ہے اک کھیل تو کھیل قدرت کے تجھے دکھلائیں کیا
عُمر کی منزل تو جوں توں کٹ گئی مرحلے اب دیکھیے پیش آئیں کیا
دل کو سب باتوں کی ہے ناصح خبر سمجھے سمجھائے کو بس سمجھائیں کیا
مان لیجے شیخ جو دعوے کرے اِک بزرگِ دیں کو ہم جھٹلائیں کیا
ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن
راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

[لہ] برسنا غصہ ظاہر کرنا - ۱۲

کاش اِک جام بھی سالک کو پلایا جاتا
اِک چراغ اور سرِ راہ جلایا جاتا

کر دیا اُس نے تو اللہ سے غافل ناصح!
اُس کو کیوں بھولتے گر اِس کو بھلایا جاتا

چپ چپاتے اُسے دے آئے دل اک بات پہ ہم
مال مہنگا نظر آتا تو چکایا جاتا

شب کو زاہد سے نہ مٹ بھیڑ ہوئی خوب ہوا
نشہ زوروں پہ تھا شاید نہ چھپایا جاتا

دل کو یہ تو نے دُکھایا ہے کہ دُکھ جاتا ہے
چیونٹی کا بھی اگر دل ہے دُکھایا جاتا

نامہ بر آج بھی خط لے کے نہ آیا یارو
تم تو کہتے تھے کہ وہ ہے ابھی آیا جاتا

عشق اُس وقت سے سر پر ترے منڈلاتا تھا
گودیوں میں تجھے تھا جب کہ کھلایا جاتا

لوگ کیوں شیخ کو کہتے ہیں کہ عیّار ہے وہ
اُس کی صورت سے تو ایسا نہیں پایا جاتا

بارہا دیکھ چکے تیرے فریب اے دُنیا
ہم سے اب جان کے دھوکا نہیں کھایا جاتا

کرتے کیا پیتے اگر مے نہ عشا سے تا صبح
وقت فرصت کا یہ کس طرح گنوایا جاتا

دل نہ طاعت میں لگا جب تو لگایا غمِ عشق
کسی دھندے میں تو آخر یہ لگایا جاتا

اُس نے اچھا ہی کیا حال نہ پوچھا دل کا
بھڑک اُٹھتا تو یہ شعلہ نہ دبایا جاتا

عشق سُنتے تھے جسے ہم وہ یہی ہے شاید
خود بخود دل میں ہے اِک شخص سمایا جاتا

اب تو تکفیر سے واعظ نہیں ہٹتا حالی
کہتے پہلے سے تو دے لے کے ہٹایا جاتا

راحت کا جہاں میں یونہیں اِک نام ہی گویا
راحت کی تلاش اِک طمع خام ہے گویا

کچھ کرتے ہیں جو یاں وہی انگشت نما ہیں
بدنام ہی دُنیا میں نکو نام ہے گویا

ناچیز ہیں وہ کام نہیں جن پہ کچھ الزام
جو کام ہیں اُن کا یہی انعام ہے گویا

ہے وقت رحیل اور وہی عشرت کے ہیں ساماں
آخر ہوئی رات اور ابھی یاں شام ہے گویا

اُٹھا تھا کچھ اوّل ہی سے یہ درد بُری طرح
آغاز ہی اُلفت کا بس انجام ہے گویا
ادبار بھی دیکھو گے جہاں پاؤ گے اِسلام
اسلام کا ادبار بھی اِک نام ہے گویا

جب دیکھیے حالی کو پڑا پایئے بے کار
کرنا اِسے باقی یہی اِک کام ہے گویا

خلوت میں تری صوفی گر نورِ صفا ہوتا
تو سب میں ملا رہتا اور سب سے جدا رہتا
تھا آفتِ جاں اُس کا اندازِ کمانداری
ہم بچ کے کہاں جاتے گر تیر خطا ہوتا
کچھ اپنی حقیقت کی گر تجھ کو خبر ہوتی
میری ہی طرح تو بھی غیروں سے خفا ہوتا
یہ لطف بناوٹ میں دیکھا نہ سُنا قاصد
اَن پڑھ ہی تو یہ کچھ ہے۔ پڑھتا تو بلا ہوتا
باتوں میں شکایت کی بو آتی ہے اُلفت کی
گر دل میں جگہ ہوتی لب پر بھی گلا ہوتا
ہم روز وداع اِس سے ہنس ہنس کے ہوئے رخصت
رونا تھا بہت ہم کو۔ روتے بھی تو کیا ہوتا
گر صاحبِ دل ہوتے سُن کر مری بے تابی
تم کو بھی قلق ہوتا اور مجھ سے سوا ہوتا
جو دل پہ گذرتی ہے کیا تجھ کو خبر ناصح
کچھ ہم سے سُنا ہوتا تب تو نے کہا ہوتا
جو جان سے در گزرے وہ چاہے سو کر گزرے
گر آج نہ تم آتے کیا جانیے کیا ہوتا

کل حالی دیوانہ کہتا تھا کچھ افسانہ
سننے ہی کے قابل تھا تم نے بھی سُنا ہوتا

پیش از ظہورِ عشق کسی کا نشاں نہ تھا
تھا حُسن میزبان کوئی مہماں نہ تھا
ہم کو بہار میں بھی سیر گلستاں نہ تھا
یعنی خزاں سے پہلے ہی دل شادماں نہ تھا
ملتے ہی اُن کے بھول گئیں کلفتیں تمام
گویا ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا
کیا جانتے تھے جائیگا جی اِک نگاہ میں
تھی دل کی احتیاط مگر بیمِ جاں نہ تھا

سچ ہے کہ پاسِ خاطرِ نازک عذاب ہے
تھا دل کو جب فراغ کہ وہ مہرباں نہ تھا
کچھ میری بیخودی سے تمھارا زیاں نہیں
تم جاننا کہ بزم میں اِک خستہ جاں نہ تھا
رات اُن کو بات بات پہ سو سو دیے جواب
مجکو خود اپنی ذات سے ایسا گماں نہ تھا
رونا ہے یہ کہ آپ بھی ہنستے ہیں ورنہ یہاں
طعنِ رقیب دل پہ کچھ ایسا گراں نہ تھا
تھا کچھ نہ کچھ کہ پھانس سی اِک دل میں چبھ گئی
مانا کہ اُس کے ہاتھ میں تیر و سناں نہ تھا
بزمِ سخن میں جی نہ لگا اپنا زینہار
شب انجمن میں **حالی** جادو بیاں نہ تھا

رنج اور رنج بھی تنہائی کا
وقت پہنچا مری رُسوائی کا ق
عُمر شاید نہ کرے آج وفا
کاٹنا ہے شبِ تنہائی کا
تم نے کیوں وصل میں پہلو بدلا
کس کو دعویٰ ہے شکیبائی کا
ایک دن راہ پہ جا پہنچے ہم
شوق تھا بادیہ پیمائی کا
اِس سے ناداں ہی بن کر بیٹھے
کچھ اجارہ نہیں دانائی کا
سات پردوں میں نہیں ٹھیرتی آنکھ
حوصلہ کیا ہے تماشائی کا
درمیاں پائے نظر ہے جب تک
ہم کو دعوے نہیں بینائی کا
کچھ تو ہے قدر تماشائی کی
ہے جو یہ شوق خود آرائی کا
اُس کو چھوڑا تو ہی لیکن اے دل
مجکو ڈر ہے تری خود رائی کا
بزمِ دشمن میں نہ جی سے اُترا
پوچھنا کیا تری زیبائی کا
یہی انجام تھا اے فصلِ خزاں؟
گُل و بلبل کی شناسائی کا
مدد اے جذبۂ توفیق کہ یاں
ہو چکا کام توانائی کا

محتسب عذر بہت ہیں لیکن
اذن ہم کو نہیں گویائی کا
ہوں گے حالی سے بہت آوارہ
گھر ابھی دُور ہے رسوائی کا

اغماض چلتے وقت مروّت سے دور تھا
رو رو کے ہم کو اور رُلانا ضرور تھا
تھی ہر نظر نہ محرمِ دیدار ورنہ یاں
ہر خار نخلِ ایمن و ہر سنگ طور تھا
ڈرتا کہ لب پہ رازِ دل آیا نہ تھا ہنوز
چرچا ہمارے عشق کا نزدیک و دور تھا
جانی نہ قدرِ رحمتِ حق پارسا نے کچھ
ٹھیرا قصوروار اگر بے قصور تھا
دُردی کشانِ بزمِ مغاں کا نہ پوچھ حال
ایک ایک رند نشۂ وحدت میں چور تھا
اب باریابِ انجمنِ عام بھی نہیں
وہ دل کہ خاص محرمِ بزمِ حضور تھا
روزِ وداع بھی شبِ ہجراں سے کم نہ تھا
کچھ صبح ہی سے شامِ بلا کا ظہور تھا
بیمار کی تو اپنے نہ لی تم نے کچھ خبر
بہرِ نماز نعش پہ آنا ضرور تھا
حالی کو ہجر میں بھی جو دیکھا تو شادماں
تھا حوصلہ اُسی کا کہ اتنا صبور تھا

دل سے خیالِ دوست بھلایا نہ جائے گا
سینے میں داغ ہے کہ مٹایا نہ جائیگا
تم کو ہزار شرم سہی مجکو لاکھ ضبط
اُلفت وہ راز ہے کہ چھپایا نہ جائیگا
اے دل رضائے غیر ہے شرطِ رضائے دوست
زنہار بارِ عشق اُٹھایا نہ جائیگا
دیکھی ہیں ایسی اُن کی بہت مہربانیاں
اب ہم سے منہ میں موت کے جایا نہ جائیگا
مے تند و ظرفِ حوصلۂ اہلِ بزم تنگ
ساقی سے جام بھر کے پلایا نہ جائیگا
راضی ہیں ہم کہ دوست سے ہو دشمنی مگر
دشمن کو ہم سے دوست بنایا نہ جائیگا

کیوں چھیڑتے ہو ذکر نہ ملنے کا رات کے   پوچھیں گے ہم سبب تو بتایا نہ جائے گا
بگڑیں نہ بات بات پہ کیوں۔ جانتے ہیں وہ   ہم وہ نہیں کہ ہم کو منایا نہ جائے گا
ملنا ہے آپ سے تو نہیں حصر غیر پر۔   کس کس سے اختلاط بڑھایا نہ جائے گا
مقصود اپنا کچھ نہ کھلا لیکن اِس قدر   یعنی وہ ڈھونڈتے ہیں جو پایا نہ جائے گا
جھگڑوں میں اہلِ دیں کے نہ حالی پڑیں بس اب
قصہ حضور سے یہ چکایا نہ جائے گا

قلق اور دل میں سوا ہو گیا   دلاسا تمھارا بلا ہو گیا   ق
دکھانا پڑے گا مجھے زخمِ دل   اگر تیر اُس کا خطا ہو گیا
سبب ہو نہ ہو لب پہ آنا ضرور   مرا شکر اُس کا گلہ ہو گیا
وہ اُمید کیا جس کی ہو انتہا   وہ وعدہ نہیں جو وفا ہو گیا
ہوا رُکتے رُکتے دمِ آخر فنا   مرض بڑھتے بڑھتے دوا ہو گیا
نہیں بھولتا اُس کی رخصت کا وقت   وہ رو رو کے ملنا بلا ہو گیا
سماں کل کا رہ رہ کے آتا ہے یاد   ابھی کیا تھا اور کیا سے کیا ہو گیا
سمجھتے تھے جس غم کو ہم جاں گزا   وہ غم رفتہ رفتہ غذا ہو گیا
نہ دے میری اُمید مجکو جواب   رہے وہ خفا گر خفا ہو گیا
ٹپکتا ہے اشعارِ حالی سے حال
کہیں سادہ دل مُبتلا ہو گیا

سنگِ گراں ہے راہ میں تمکین یار کا   اب دیکھنا ہے زورِ دلِ بے قرار کا   ق
اِک خو سی ہو گئی ہے تحمل کی ورنہ اب   وہ حوصلہ رہا نہیں صبر و قرار کا

آؤ مٹا بھی دو خلش آرزوئے قتل   کیا اعتبار زندگیِ مستعار کا
ہم خوش کبھی ہوئے ہوں تو غم ناگوار ہو   ملتا نہیں محل گلۂ روزگار کا
سمجھو مجھے اگر ہے تمھیں آدمی کی قدر   میرا اک التفات نہ مرنا ہزار کا
گر صبح تک وفا نہ ہوا وعدۂ وصال   سُن لیں گے وہ مآل شب انتظار کا
اب محو بوئے گُل پہ ہوا کب لے آئیں   ہم کو چمن سے یاد ہے جانا بہار کا
ہر سمت گرد ناقۂ لیلےٰ بلند ہے   پہنچے جو حوصلہ ہو کسی شہسوار کا
غربت کے مشغلوں نے وطن کو بُھلا دیا   خانہ خراب خاطرِ اُلفت شعار کا
حالی بس اَب یقیں ہے کہ دلّی کے ہو رہے   ہے ذرّہ ذرّہ مہر فزا اس دیار کا

ب

درد دل کو دوا سے کیا مطلب   کیمیا کو طلا سے کیا مطلب
چشمۂ زندگی ہے ذکرِ جمیل   خضر و آبِ بقا سے کیا مطلب
بادشاہی ہے نفس کی تسخیر   ظلِّ بالِ ہما سے کیا مطلب
جو کریں گے بھریں گے خود واعظ   تم کو میری خطا سے کیا مطلب
جن کے معبود حور و غلماں ہیں   اُن کو زاہد خدا سے کیا مطلب
کام ہے مردمی سے انساں کی   قطعہ   زہد یا اتقا سے کیا مطلب
ہے اگر رند دامن آلودہ   ۲   ہمکو چون و چرا سے کیا مطلب
صوفیِ شہر باصفا ہے اگر   ۳   ہو ہماری بلا سے کیا مطلب

نکہتِ مے پہ غش ہیں جو حالی
اُن کو دُرد و صفا سے کیا مطلب

مجھ میں وہ تابِ ضبطِ شکایت کہاں ہے اب
چھیڑو نہ تم کہ میرے بھی منہ میں زباں ہے اب ق
وہ دن گئے کہ حوصلۂ ضبطِ راز تھا
چہرے سے اپنے شورشِ پنہاں عیاں ہے اب
جس دل کو قیدِ ہستیِ دنیا سے تنگ تھا
وہ دل اسیرِ حلقۂ زلفِ بتاں ہے اب
آنے لگا جب اُس کی تمنا میں کچھ مزا
کہتے ہیں لوگ جان کا اِس میں زیاں ہے اب
لغزش نہ ہو بلا ہے حسینوں کا التفات
اے دل سنبھل وہ دشمنِ دیں مہرباں ہے اب
اِک جرعۂ شراب نے سب کچھ بھلا دیا
ہم ہیں اور آستانۂ پیرِ مُغاں ہے اب
ہے وقتِ نزع اور وہ آیا نہیں ہنوز
ہاں جذبِ دل مدد کہ دمِ اِمتحاں ہے اب
ہے دل غمِ جہاں سے سبکدوش اِن دنوں
سر پڑتا سوجھتا کوئی بارِ گراں ہے اب

حالی تم اور ملازمتِ پیرِ مے فروش
وہ علمِ دیں کدھر ہے وہ تقویٰ کہاں ہے اب

پ

یہ ہیں واعظ سب پہ منہ آتے ہیں آپ
ناصحِ قوم اِس پہ کہلاتے ہیں آپ
بس بہت طعن و ملامت کر چکے
کیوں زباں رندوں کی کھلواتے ہیں آپ
ہے صراحی میں وہی لذت کہ جو
چڑھ کے منبر پر مزا پاتے ہیں آپ
واعظو ہے ان کو شرمانا گناہ
جو گنہ سے اپنے شرماتے ہیں آپ
کرتے ہیں ایک اِک کی تکفیر آپ کیوں
اِس پہ بھی کچھ غور فرماتے ہیں آپ
کرتے ہیں آباد دوزخ کو حضور ق
خلد کو ویران کرواتے ہیں آپ

چھیڑ کر واعظ کو حالی خلد سے
بسترا کیوں اپنا پھکواتے ہیں آپ

ت

گو جوانی میں تھی کج رائی بہت
پر جوانی ہم کو یاد آئی بہت
زیرِ برقع تو نے کیا دِکھلا دیا
جمع ہیں ہر سو تماشائی بہت
ہٹ پہ اُسکی اور پس جاتے ہیں دل
راس ہے کچھ اُس کو خود رائی بہت
سرو یا گل آنکھ میں جچتے نہیں
دل پہ ہے نقش اُسکی رعنائی بہت
چور تھا زخموں میں اور کہتا تھا حُر
راحت اس تکلیف میں پائی بہت
آ رہی ہے چاہِ یوسف سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت
وصل کے ہو ہو کے ساماں رہ گئے
مینہ نہ برسا اور گھٹا چھائی بہت
جاں نثاری پر وہ بول اُٹھے مری
ہیں فدائی کم تماشائی بہت
ہم نے ہر ادنیٰ کو اعلیٰ کر دیا
خاکساری اپنی کام آئی بہت
کر دیا چپ واقعاتِ دہر نے
تھی کبھی ہم میں بھی گویائی بہت
گھٹ گئیں خود تلخیاں ایّام کی؟
یا گئی کچھ بڑھ شکیبائی بہت
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی چُپ رہو
راست گوئی میں ہے رُسوائی بہت

اُس کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صورت
نہ وہ دیوار کی صورت ہے نہ در کی صورت
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بلبل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صورت
ہے غمِ روزِ جُدائی نہ نشاطِ شبِ وصل
ہو گئی اور ہی کچھ شام و سحر کی صورت
اپنی جیبوں سے رہیں سارے نمازی ہُشیار
اک بزرگ آتے ہیں مسجد میں خضر کی صورت
دیکھیے شیخ مصوّر سے کھچے یا نہ کھچے
صورت۔ اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صورت
کیا خبر زاہدِ قانع کو کہ کیا چیز ہے حرص
اُس نے دیکھی ہی نہیں کیسۂ زر کی صورت
ہیں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے۔ تسلیم سپر کی صورت
شوق ہیں اُس کے مزا۔ درد میں اُسکے لذت
ناصحو اُس سے نہیں کوئی مفر کی صورت
حملہ اپنے پہ بھی اِک بعد ہزیمت ہی ضرور
رہ گئی ہے یہی اِک فتح و ظفر کی صورت
رہنماؤں کے ہوئے جاتے ہیں اوسان خطا
راہ میں کچھ نظر آتی ہے خطر کی صورت
یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت
اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

بناتے ہیں وہ مہربانی کی صورت
پہ چھپتی نہیں سرگرانی کی صورت
جسے دیکھکر دل ہو عاشق کا بیکل
وہ ہے اور ہی مہربانی کی صورت
شبِ وعدہ ہی بارِ عام اُن کے در پر
مرے حق میں اک پاسبانی کی صورت
غمِ دل نے رُسوا کیا ہم کو آخر
بنائی بہت شادمانی کی صورت
ہی اِس ریش پر وسمہ کیا خوب کھلتا
ذرا دیکھنا شیخِ فانی کی صورت
یقیں ہی کہ ہم جس کو سمجھے ہیں مرنا
یہی ہو تو ہو زندگانی کی صورت
سمجھ کر کرو قتلِ حالی کو دیکھو
مٹاؤ نہ عشق و جوانی کی صورت

ٹ

تو نہیں ہوتا تو رہتا ہے اُچاٹ
دل کو یہ کیسی لگا دی تو نے چاٹ

گونج رہی ہے کان میں یاں لے وہی
اور مغنّی نے کئی بدلے ہیں ٹھاٹ

ناؤ ہے بوسیدہ اور موجیں ہیں سخت
اور دریا، بہت چکلا ہے پاٹ

اِک کہانی ہے ہرمزن کی رہ گئی
راج کِسریٰ کا رہا باقی نہ پاٹ

دیر سے مسجد میں ہم آئے تو ہیں
ہے مگر یاں جی کچھ اے زاہد اُچاٹ

جو کہے تجکو بتا دیں اے امیر
ہیں بہت سرکار کی محفل میں بھاٹ

ملتیں رستوں کی ہیں سب ہیر پھیر
سب جہازوں کا ہے لنگر ایک گھاٹ

برق منڈلاتی ہے اب کس چیز پر
ٹڈیاں کب کی گئیں کھیتی کو چاٹ

تیغ میں بُرّش یہ اے حالی نہیں
جس قدر تیری زبان کرتی ہے کاٹ

چٹکیاں سی دِل میں یہ لیتا ہے کون
شعر تو ظاہر میں ہیں تیرے سپاٹ

ث

باپ کا ہے جب ہی پسر وارث
ہو ہنر کا بھی اُس کے گر وارث

گھر ہنرور کا نا خلف نے لیا
تیرا ہے کون اے ہنر وارث

فاتحہ ہو کہاں سے میت کی
لے گئے ڈھو کے سیم و زر وارث

ہوں اگر ذوقِ کسب سے آگاہ
کریں میراث سے حذر وارث

خاک دکرمانِ گورد خویش و تبار
ایک میت اور اس قدر وارث

واعظو دین کا خدا حافظ
انبیا کے ہو تم اگر وارث

قوم سبلے پر ہے دین بے کس ہے
گئے اسلام کے کدھر وارث

ہم پہ بیٹھے ہیں ہاتھ دھوئے حریف
جیسے مُردہ کے مال پر وارث

ترکہ چھوڑا ہے کچھ اگر حالی
کیوں ہیں میّت پہ نوحہ گر وارث

بھید واعظ اپنا کھلوایا عبث
دل جلوں کو تو نے گرمایا عبث

جلوہ صوفی نے نہ دکھلایا کوئی
رات بھر یاروں کو جگوایا عبث

شیخ رندوں میں بھی ہیں کچھ پاکباز
سب کو ملزم تو نے ٹھہرایا عبث

کوئی پنچھی آ کے اب پھنستا نہیں
آپ نے جال اپنا پھیلایا عبث

آ نکلتے تھے کبھی مسجد میں ہم
تو نے زاہد ہم کو شرمایا عبث

کھیتیاں جل کر ہوئیں یارونکی خاک
ابر ہے گھر کر ادھر آیا عبث

ج

بات کچھ ہم سے بن نہ آئی آج
بول کر ہم نے منہ کی کھائی آج

چُپ پر اپنی بھرم تھے کیا کیا کچھ
بات بگڑی بنی بنائی آج

شکوہ کرنے کی خو نہ تھی اپنی
پر طبیعت ہی کچھ بھر آئی آج

بزم ساقی نے دی اُلٹ ساری
خوب بھر بھر کے خُم لنڈھائی آج

معصیت پر ہے دیر سے یارب
نفس اور شرع میں لڑائی آج

غالب آتا ہے نفسِ دوں یا شرع
دیکھنی ہے تری خدائی آج

چور ہے دل میں کچھ نہ کچھ یارو
نیند پھر رات بھر نہ آئی آج

کل یہاں کاروبار ہیں سب بند
کر لو کرنی ہے جو کمائی آج

زد سے اُلفت کی بچ کے چلنا تھا
مفت حالی نے چوٹ کھائی آج

تلخی دوراں کے ہیں سب شکوہ سنج
یہ بھی ہے یاد کوئی رنجوں میں رنج
رنج و شادی یاں کے ہیں سب بے ثبات
اور اگر سوچو تو شادی ہے نہ رنج
تھا قناعت میں نہاں گنج فراغ
پر ہمیں بے وقت ہاتھ آیا یہ گنج
فکر و سن بڑھتے تھے شاید ساتھ ساتھ
ہیں وہ اب پنجاہ جو پہلے تھے پنج
ہم کو بھی آتا تھا ہنسنا بولنا
جب کبھی جیتے تھے ہم اے بذلہ سنج
آگئی مرگِ طبیعی ہمکو یاد
شاخ سے دیکھا جو خود گرتا ترنج

راہ اب سیدھی ہے حالی سوئے دوست
ہو چکے طے سب خم و پیچ و شکنج

چ

بزم سے اچھی ہے - گو دنیا ہے اے میخوار ہیچ
یہاں سمجھ لیتے تو ہیں دُنیا کو دم بھر یار ہیچ
نفس سے مہر بر ہوئی دانش نہ صبر و عقل و ہوش
ایک دشمن برسرِ کیں ہو تو ہیں سب یار ہیچ
شیخ! جو مخلص ہیں وہ رکھتے نہیں کچھ اِمتیاز
ہے یہ سب اونچی دُکاں اور رونقِ بازار ہیچ
شاہدِ معنی کو آرائش کی کچھ حاجت نہیں
سبحہ و سجّادہ ہیچ اور جبّہ و دستار ہیچ
ہو گرجتے جس قدر اتنے برستے تم نہیں
اے فصیحو ہے یہ سب گفتار بے کردار ہیچ

خوانِ نعمت نے ترے اے عاملِ مردار خوار
کر دیے آفاق کے سب خوان و خواں سالار ہیچ

ہے ادب مسند پہ جو کچھ ہے رئیسِ شہر کا
ہٹ کے مسند سے جو خود دیکھیں تو ہیں سرکار ہیچ

گو کہ حالی اگلے اُستادوں کے آگے ہیچ ہے
کاش ہوتے ملک میں ایسے ہی اب دو چار ہیچ

ح

کاٹیے دن زندگی کے اُن یگانوں کی طرح
جو سدا رہتے ہیں چوکس پاسبانوں کی طرح

منزلِ دنیا میں ہیں پا در رکاب آٹھوں پہر
رہتے ہیں جہاں سرا میں میہمانوں کی طرح

سعی سے اُکتاتے اور محنت سے کنیاتے نہیں
جھیلتے ہیں سختیوں کو سخت جانوں کی طرح

رسم و عادت پر ہیں کرتے عقل کو فرمانروا
نفس پر رکھتے ہیں کوڑا حکمرانوں کی طرح

شادمانی میں گزرتے اپنے آپے سے نہیں
غم میں رہتے ہیں شگفتہ شادمانوں کی طرح

رکھتے ہیں تمکیں جوانی میں بڑھاپے سے سوا
رہتے ہیں چونچال پیری میں جوانوں کی طرح

پاتے ہیں اپنوں میں غیروں سے سوا بیگانگی
پر بھلا تکتے ہیں ایک اِک کا یگانوں کی طرح
اس کھیتی کے پنپنے کی اُنھیں ہو یا نہ ہو
ہیں اُسے پانی دیے جاتے کسانوں کی طرح
اُن کے غصے میں ہے دل سوزی ملامت میں پیار
مہربانی کرتے ہیں نامہربانوں کی طرح
کام سے کام اپنے اُن کو - گو ہو عالم نکتہ چیں
رہتے ہیں بتیس دانتوں میں زبانوں کی طرح
طعن سُن سُن احمقوں کے ہنستے ہیں دیوانہ وار
دن بسر کرتے ہیں دیوانوں میں سیانوں کی طرح
کیجے کیا حالی - نہ کیجے سادگی گر اختیار
بولنا آئے نہ جب رنگیں بیانوں کی طرح

خ

مے مغاں کا ہے چسکا اگر بُرا اے شیخ
تو ایسی ہی کوئی چاٹ اور دے لگا اے شیخ
ریا کو صدق سے ہے جامِ مے بدل دیتا
تمھیں بھی ہے کوئی یاد ایسی کیمیا اے شیخ
وہ نکلے بھان متی جو بناتے تھے اکسیر
تماشے دیکھے ہیں یہ ہم نے بارہا اے شیخ
غرورِ فقر و غرورِ غنا میں فرق ہے کیا
تجھی یہ رکھتے ہیں ہم منحصر بتا اے شیخ
زباں پہ ہوتی ہے مُہر اُن کی جو ہیں محرمِ راز
پھر ایسا کیجیو ہرگز نہ ادعا اے شیخ
قطعہ خبر بھی ہے تمھیں؟ کیا بن رہی ہے بیڑے پر
ہیں آپ جو نسے بیڑے کے ناخدا اے شیخ

وہ ڈوبتوں سے الگ رہتے ہیں جو ہیں تیراک — شناوری کا ہی گر ہے یہ مرحبا اے شیخ
گوزن و گور ہیں بچپن سے تارکِ دنیا — نہایت آپ کی ہے۔ اُنکی ابتدا اے شیخ

کمالِ حسنِ عقیدت سے آیا تھا حالی
یہ خانقاہ سے افسردہ دل گیا اے شیخ

د

شادی کے بعد غم ہے فقیری غنا کے بعد — اب خوف کے سوا ہے دھرا کیا رجا کے بعد
ہے سامنا بلا کا پس از عافیت ضرور — ہوتی ہے عافیت کی توقع بلا کے بعد
تعزیرِ جرمِ عشق ہے بے صرفہ محتسب — بڑھتا ہے اور ذوقِ گنہ یاں سزا کے بعد
گر درد دل سے پائی بھی اے چارہ گر شفا — آتی ہے دل کی موت نظر اس شفا کے بعد
یادِ خدا میں جب نہ گئی دل سے اُس کی یاد — آگے خدا کا نام ہے ناصح خدا کے بعد
کرتے رہے خطائیں ندامت کے بعد ہم — ہوتی رہی ہمیشہ ندامت خطا کے بعد
آخر کو ماننا پڑا اے نفسِ خیرہ سر — تیرا بھی حکم کم نہیں حکمِ قضا کے بعد
مدت سے تھی دعا کہ ہوں بدنام شہر شہر — بارے ہوئی قبول بہت التجا کے بعد

حالی کی سن لو اور صدائیں جگر خراش
دلکش صدا سنو گے نہ پھر اس صدا کے بعد

کہیں خوف اور کہیں غالب ہے رجا اے زاہد — تیرا قبلہ ہے جدا میرا جدا اے زاہد
درگزر گر نہیں کرتا تو گنہگاروں سے — تو ترا اور کوئی ہوگا خدا اے زاہد
ہم دکھا دیں گے کہ زہاد ہے نیکی کچھ اور — کچھ بہت دور نہیں روزِ جزا اے زاہد
قربِ حق کے لیے کچھ سوزِ نہاں بھی ہے ضرور — خشک نفلوں میں دھرا کیا ہے بھلا اے زاہد

میں تو سو بار ملوں دل نہیں ملتا تم سے   تو ہی کہہ اسمیں ہی کیا میری خطا اے زاہد
جال جبتک ہی یہ پھیلا ہوا دینداری کا   فکر دنیا کا کرے تیری بلا اے زاہد

عیب حالی کے بہت آج کیے تو نے بیاں
ذکر کچھ اور کر اب اس کے سوا اے زاہد

ذ

پیاس تیری لجئے ساغر سے لذیذ   بلکہ جامِ آبِ کوثر سے لذیذ
جس کا تو قاتل ہو پھر اُس کے لیے   کونسی نعمت ہی خنجر سے لذیذ
لطف ہو تیری طرف سے یا عتاب   ہم کو ہی سب شہد و شکر سے لذیذ
قند سے شیریں تری پہلی نگاہ   دوسری قند مکرر سے لذیذ
جھا تجھ میں جس بھوک کی بھولے نہ تو   بھوک ہی وہ شیرِ مادر سے لذیذ
ہی یہ تجھ میں کس کی بو باس اے صبا   بوئے بید و مشک و عنبر سے لذیذ
جو قناعت کے ہیں حالی میہماں   اُن کو فاقے ہیں مزعفر سے لذیذ

ر

ہے یہ تکیہ تری عطاؤں پر   وہی اصرار ہے خطاؤں پر
رہیں نا آشنا زمانہ سے   حق ہے تیرا یہ آشناؤں پر
رہرو و باخبر رہو کہ گماں   رہزنی کا ہے رہنماؤں پر
ہی وہ دیر آشنا تو عیب ہے کیا   مرتے ہیں ہم انھیں اداؤں پر
اُسکے کوچہ میں ہیں وہ بے پروبال   اُڑتے پھرتے ہیں جو ہواؤں پر
شہسواروں پہ بند ہے جو راہ   وقف ہی یاں برہنہ پاؤں پر

نہیں منعم کو اُس کی بوند نصیب   مینہ برستا ہے جو گداؤں پر
نہیں محدود بخششیں تیری   زاہدوں پر نہ پارساؤں پر
حق سے درخواست عفو کی حالی
کیجے کس منہ سے اِن خطاؤں پر

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر   ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر
جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار   عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر
دوست اِسکے ہیں نہ اُسکے آشنا   گو بظاہر سب کے ہیں شیر و شکر
خصلتیں روباہ کی رکھتے ہیں ہم   گو دکھاتے آپ کو ہیں شیر نر
اپنی نیکی کا دلاتے ہیں یقیں   کرتے ہیں نفرت بدی سے جسقدر
کرنی پڑتی ہی کسی کی مدح جب   کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر
گر کسی کا عیب سُن پاتے ہیں ہم   کرتے ہیں سوا اُسے دل کھولکر
کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی   شکر کے ہیں اُس سی خواہاں عمر بھر
ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں ہم   ہوں کسی کے ہم یہ لاکھ احساں اگر
عیب کچھ گنتے نہیں اُس عیب کو   جس سے ہوں اپنے سوا سب بیخبر
خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں   کھینچکر لاتے ہیں اُس کو سوئے شر
بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو   عیب اُن کا ظاہر اور اپنا ہنر
دوست اِک عالم کے پر مطلب کے دوست   ایسے یاروں سے حذر یارو حذر
عیب حالی اپنے یوں کہتا ہی کون
خواہشِ تحسیں ہے حضرت کو مگر

ہوگی نہ قدر جان کی قرباں کیے بغیر
دام اُٹھیں گے نہ جنس کے ارزاں کیے بغیر
گو ہو شفا سے یاس۔ پہ جبتک ہے دم میں دم
بن آئے گی نہ درد کا درماں کیے بغیر
بگڑی ہوئی بہت ہے کچھ اس باغ کی ہوا
یہ باغ کو رہے گی نہ ویراں کیے بغیر
آمادہ دہر پردہ دری پر ہے قوم کی
مبروص کو رہے گا نہ عُریاں کیے بغیر
عزت سے اپنی یاروں کو کچھ آپڑی ہے ضد
چھوڑیں گے نیمجاں کو نہ بیجاں کیے بغیر
مشکل بہت ہے گو کہ مٹانا سلف کا نام
مشکل کو ہم ٹلیں گے نہ آساں کیے بغیر
گو مے ہے تند و تلخ۔ پہ ساقی ہے دلربا
اے شیخ بن پڑے گی نہ کچھ ہاں کیے بغیر
تکفیر جو کہ کرتے ہیں ابنائے وقت کی
چھوڑے گا وقت اُنھیں نہ مسلماں کیے بغیر

حالی کٹے گا کاٹنے ہی سے یہ بے ستوں
حل ہونگی مشکلیں نہ یہ آساں کیے بغیر

ڑ

گھر ہے وحشت خیز اور بستی اُجاڑ
ہو گئی اِک اِک گھڑی تجھ بن پہاڑ
آج تک قصرِ امل ہے ناتمام
بندھ چکی ہے بارہا کھُل کھُل کے باڑ
ہے پہنچنا اپنا چوٹی تک محال
اے طلب نکلا بہت اونچا پہاڑ
کھیلنا آتا ہے ہم کو بھی شکار
پر نہیں زاہد کوئی ٹٹی کی آڑ
دل نہیں روشن تو ہیں کس کام کے
سو شبستاں میں اگر روشن ہیں جھاڑ
عید اور نوروز ہے سب دل کے ساتھ
دل نہیں حاضر تو دنیا ہے اُجاڑ
کھیت رستے پر ہے اور رہرو سوار
کشت ہے سرسبز اور نیچی ہے باڑ
بات واعظ کی کوئی پکڑی گئی
اِن دنوں کم تر ہے کچھ ہم پر لتاڑ

تم نے حالی کھول کر اپنی زباں   کر لیا ساری خدائی سے بگاڑ

ز

عہدِ وصالِ دل نے بھلایا نہیں ہنوز   عالم مری نظر میں سمایا نہیں ہنوز   ق
پیغامِ دوست کا کوئی لایا نہیں ہنوز   جھونکا نسیمِ مصر کا آیا نہیں ہنوز
لگ جائے دل نہ منزلِ مقصود میں کہیں   ہم جسکو ڈھونڈتے ہیں وہ پایا نہیں ہنوز
آیا نہ ہوگا اُس کو تغافل میں کچھ مزا   ذوقِ نگاہ ہم نے جتایا نہیں ہنوز
ایمن میں آگ لگ چکی اور طور جل چکا   اُس نے نقابِ رُخ سے اُٹھایا نہیں ہنوز
یاں دے چکی جواب اُمیدِ جوابِ خط   واں نامہ بر نے بار بھی پایا نہیں ہنوز
پایا ہے ذوق و شوق میں ہم کو بھرا ہوا   کافر نے اختلاط بڑھایا نہیں ہنوز
کیا دل سے بعدِ مرگ بھی جاتی نہ تیری یاد   بھولے ہیں کہ تجھکو بھلایا نہیں ہنوز
سرمایۂ خلافِ دو عالم ہے رازِ دل   باتوں میں ہم نے زہر ملایا نہیں ہنوز

کس نشہ میں ہے چور خدا جانے اس قدر
حالی نے جام منہ سے لگایا نہیں ہنوز

جیتے جی موت کے تم منہ میں نہ جانا ہرگز   دوستو دل نہ لگانا نہ لگانا ہرگز
عشق بھی تاک میں بیٹھا ہے نظر بازوں کی   دیکھنا شیر سے آنکھیں نہ لڑانا ہرگز
زال کی پہلی ہی رستم کو نصیحت یہ تھی   زد میں تیرِ صفِ مژگاں کی نہ جانا ہرگز
چاہت اِک طلعتِ مکروہ ہے برقع میں نہاں   کسی دلّالہ کے دھوکے میں نہ آنا ہرگز
ہاتھ ملنے نہ ہوں پیری میں اگر حسرت سے   تو جوانی میں نہ یہ روگ لگانا ہرگز
جتنے رہنے تھے ترے ہو گئے ویراں اے عشق   آ کے ویرانوں میں اب گھر نہ بسانا ہرگز

کوچ سب کر گئے دلّی سے ترے قدر شناس
قدر یاں رہ کے اب اپنی نہ گنوانا ہرگز

تذکرہ دہلیِ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانا ہرگز

داستاں گل کی خزاں میں نہ سنا اے بلبل
ہنستے ہنستے ہمیں ظالم نہ رلانا ہرگز

ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے مطرب
درد انگیز غزل کوئی نہ گانا ہرگز

صحبتیں اگلی مصوّر ہمیں یاد آئیں گی
کوئی دلچسپ مرقع نہ دکھانا ہرگز

موجزن دل میں ہیں یاں خون کے دریا اے چشم
دیکھنا ابر سے آنکھیں نہ چرانا ہرگز

لیکے داغ آئیگا سینہ پہ بہت اے سیّاح
دیکھ اس شہر کے کھنڈروں میں نہ جانا ہرگز

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہرِ یکتا تہِ خاک
دفن ہوگا کہیں اتنا نہ خزانا ہرگز

مٹ گئے تیرے مٹانے کے نشاں بھی اب تو
اے فلک اس سے زیادہ نہ مٹانا ہرگز

وہ تو بھولے تھے ہمیں ہم بھی انھیں بھول گئے
ایسا بدلا ہے نہ بدلے گا زمانا ہرگز

جس کو زخموں سے حوادث کے اچھوتا سمجھیں
نظر آتا نہیں ایک ایسا گھرانا ہرگز

ہم کو گر تو نے رلایا تو رلایا اے چرخ
ہم پہ غیروں کو تو ظالم نہ ہنسانا ہرگز

یار خود روئیں گے کیا اُن پہ جہاں روتا ہے
اُنکی ہنستی ہوئی شکلوں پہ نہ جانا ہرگز

آخری دور میں بھی تجکو قسم ہے ساقی
بھر کے اک جام نہ پیاسوں کو پلانا ہرگز

بخت سوئے ہیں بہت جاگ کے اے دورِ زماں
نہ ابھی نیند کے ماتوں کو جگانا ہرگز

یاں سے رخصت ہو سویرے کہیں اے عیش و نشاط
نہیں اس دور میں یاں تیرا ٹھکانا ہرگز

کبھی اے علم و ہنر گھر تھا تمھارا دلّی
ہم کو بھولے ہو تو گھر بھول نہ جانا ہرگز

شاعری مر چکی اب زندہ نہ ہو گی یارو
یاد کر کر کے اُسے جی نہ کڑھانا ہرگز

غالب و شیفتہ و نیّر و آزردہ و ذوق
اب دکھائے گا یہ شکلیں نہ زمانا ہرگز

مومن و علوی و صہبائی و ممنون کے بعد
شعر کا نام نہ لے گا کوئی دانا ہرگز
کر دیا مر کے یگانوں نے یگانہ ہم کو
ورنہ یاں کوئی نہ تھا ہم میں یگانا ہرگز
داغ و مجروح کو سن لو کہ پھر اس گلشن میں
نہ سنے گا کوئی بلبل کا ترانا ہرگز
رات آخر ہوئی اور بزم ہوئی زیر و زبر
اب نہ دیکھو گے کبھی لطفِ شبانا ہرگز
بزمِ ماتم تو نہیں - بزمِ سخن ہے **حالی**
یاں مناسب نہیں رو رو کے رلانا ہرگز

رنجش و التفات و ناز و نیاز
ہم نے دیکھے بہت نشیب و فراز
عشق کی آنچ اُس میں پاتا ہوں
دل ذرا دیکھتا ہوں جس کا گداز
شیخ! اللہ ری تیری عیاری
کس توجہ سے پڑھ رہا ہے نماز
اک پتے کی جو ہم نے کہدی آج
رنگ واعظ کا کر گیا پرواز
ہم کو نسبت پہ فخر ہے تیری
تو گئی بھول ہم کو خاکِ حجاز
آج منکر بھی ناچ اُٹھیں گے
گر مغنی کی ہے یہی آواز
خیر ہی[لہ] اے فلک کہ چار طرف
قطعہ چل رہی ہیں ہوائیں کچھ ناساز
رنگ بدلا ہوا ہے عالم کا
۲ ہیں دگرگوں زمانہ کے انداز
ہوتے جاتے ہیں زورمند ضعیف
۳ بنتے جاتے ہیں مبتذل ممتاز
چھپتے پھرتے ہیں کبک و تیہو سے
۴ گھونسلوں میں عقاب اور شہباز
ہے نہتوں کو رہ گذر میں خطر
۵ رہزنوں نے کیے ہیں ہاتھ دراز

[لہ] یہ قطعہ اُس وقت لکھا گیا جبکہ ٹرکی کو سلطان عبدالعزیز خاں کے قتل کے بعد سرویہ مانٹی نگرو اور روس وغیرہ کے مقابلہ میں اخیر صدمہ پہنچا - ۱۲

ٹڈیوں کا ہے کھیتوں پہ ہجوم ۶ بھیڑیوں کے ہیں خوں میں تر لبِ آز
ناتوانوں پہ گدھ ہیں منڈلاتے ۷ گھائلوں پر ہیں آئے تیر انداز
تشنۂ خوں ہیں بھوکے شیروں کے ۸ حیلہ گر روبہوں کے عشوہ و ناز
دشمنوں کے ہیں دوست خود جاسوس ۹ اور یاروں کے یار ہیں غماز
ہوگا انجام دیکھیے کیا کچھ ۱۰ ہے پُر آشوب جبکہ یہ آغاز
ے ابھی تک کھلی نہیں لیکن ۱۱ غیب سے آ رہی ہے کچھ آواز
وقت نازک ہے اپنے بیڑے پر ۱۲ موج حائل ہے اور ہوا ناساز
یا تھپیڑے ہوا کے سہ کے اُبھرے ۱۳ یا گیا کشمکش میں ڈوب جہاز
کام اُسے اپنے سونپ دو حالی ۱۴ نہیں جس کا شریک اور انباز
ہے وہ مالک ڈبوئے خواہ ترائے ۱۵ چارہ یاں کیا ہے غیرِ عجز و نیاز

س

اذبِ رحمت ہے مقناطیس عصیاں اپنے پاس
رکھتے ہیں عاصی کمندِ صیدِ غفراں اپنے پاس
اجزوں سے مقتدر کرتے ہیں اکثر در گذر
عجز اپنا ہے کلیدِ بابِ رضواں اپنے پاس
گی گر کچھ سمجھتے ہیں خطا فرمان سے
عذر خواہ اپنا ہے خود فرمانِ سلطاں اپنے پاس

بام بتلایا بلند اور نارسا بخشی کمند
رکھتے ہیں ہم اپنی معذوری پہ بُرہاں اپنے پاس
خاک میں ہم نے ملا رکھی ہے اکسیر اپنی آپ
ورنہ ہے ہر درد کا موجود درماں اپنے پاس
دستبردِ اہرمن کا جس کو کچھ کھٹکا نہیں
ہے بحمد اللہ وہ مُہرِ سُلیماں اپنے پاس
دیکھنا حالی نہ دینا وضعِ فطرت کو بدل
ہے یہ دستاویزِ استخلافِ رحماں اپنے پاس

چھیڑ اب نہ اے تصورِ مژگانِ یار بس   کافی ہے خار - خارِ غمِ روزگار بس
یہ غم نہیں ہے وہ جسے کوئی بٹا سکے   غمخواری اپنی رہنے دے اے غمگسار بس
ہر داغ فصلِ گُل کی نشانی ہے اے صبا   گلگشت کو بہت ہے دلِ داغدار بس
ڈر ہے دلوں کے ساتھ اُمیدیں بھی پس نہ جائیں   اے آسیائے گردشِ لیل و نہار بس
دیں غیر دشمنی کا ہماری خیال چھوڑ   یاں دشمنی کے واسطے کافی ہیں یار بس
آتا نہیں نظر کہ ہو یہ رات اب سحر   کی نیند کیوں حرام بس اے انتظار بس
تھوڑی ہے رات اور کہانی بہت بڑی
حالی نکل سکیں گے نہ دل کے بخار بس

ش

اِک ہم کو جہد بر سرِ ایام ہے درپیش   بنتا نظر آتا نہیں جو کام ہے درپیش
غفلت ہے کہ گھیرے ہوئے ہے چار طرف سے   اور معرکۂ گردشِ ایام ہے درپیش

وہ دن گئے جب تھا مرضِ ضعف کا آغاز
اب اِس مرضِ ضعف کا انجام ہی درپیش
گو صبح بھی تھی روزِ مصیبت کی قیامت
پر صبح تو جوں توں کٹی اب شام ہی درپیش
وہ وقت گیا۔ نشہ تھا زوروں پہ جب اپنا
اب وقتِ خمارِ مئے گلفام ہی درپیش
اُمید شفا کا تو جواب آ ہی چکا ہے
اب موت کا سُننا ہمیں پیغام ہی درپیش
جی اُس کا کسی کام میں لگتا نہیں زنہار
ظاہر ہی کہ حالی کو کوئی کام ہی درپیش

ص

ہر بشر سے اُسکی مختص ہیں عطائیں خاص خاص
ہر مرض کو راس ہیں جیسے دوائیں خاص خاص
دل تو اپنا پھر چکا ہے زالِ دُنیا سے۔ مگر
رہزنِ دل ہیں ابھی اُسکی ادائیں خاص خاص
گو زمانہ نے بُھلا دی دل سے اپنے فصلِ گُل
یاد ہیں لیکن وہ بُلبُل کی صدائیں خاص خاص
زہد و تقوےٰ سے نہیں ہوتیں دعائیں مستجاب
وقت ہیں کچھ خاص خاص اور ہیں ادائیں خاص خاص
یوں تو ہے اُمید سب کچھ۔ پر نہ ہوں شاید معاف
وہ جو کی ہیں ہم نے اے حالی خطائیں خاص خاص

درد اور درد کی ہی سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص
حور و غلماں کے لیے لائیں دِل آخر کس کا
ہونے دیتا نہیں یاں عہدہ برا ایک ہی شخص
قافلے گذریں وہاں کیونکہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن اور راہ نما ایک ہی شخص
قیس سا پھر کوئی اُٹھا نہ بنی عامر میں
فخر ہوتا ہی گھرانے کا سدا ایک ہی شخص
جھگڑے دیکھے ہیں جن لوگوں کے اِن آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص
گھر ہیں برکت ہی مگر فیض ہے جاری شب و روز
کچھ نہیں شیخ۔ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

اعتراضوں کا زمانہ کے ہے حالی یہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہی کیا ایک ہی شخص؟

ض

عشق کو ترکِ جنوں سے کیا غرض
چرخِ گرداں کو سکوں سے کیا غرض
دل میں ہے اے خضر گر صدقِ طلب
راہ رو کو رہنموں سے کیا غرض
حاجیو ہے ہم کو گھر والے سے کام
گھر کے محراب و ستوں سے کیا غرض
گنگنا کر آپ رو پڑتے ہیں جو
اُن کو چنگ و ارغنوں سے کیا غرض
نیک کہنا نیک جس کو دیکھنا
ہمکو تفتیشِ درون سے کیا غرض
دوست ہیں جب زخمِ دل سے بیخبر
اُن کو اپنے اشکِ خوں سے کیا غرض
عشق سے ہے مجتنب زاہد عبث
شیر کو صیدِ زبوں سے کیا غرض
کر چکا جب شیخ تسخیرِ قلوب
اب اُسے دنیائے دوں سے کیا غرض
آئے ہو حالی پئے تسلیم یاں
آپ کو چون و چگوں سے کیا غرض

دوست کا ناروا نہیں اعراض
دوستوں ہی کا کام ہے اغماض
چاہیے ایک سب کا ہو مقصود
گو ہوں سب کی جُدا جُدا اغراض
یاد میں تیری سب کو بھول گئے
کھو دیئے ایک دُکھ نے سب امراض
دیکھیے تو بھی خوش ہی یا ناخوش
اور تو ہم سے سب ہیں کچھ ناراض
لَا اُبالی بِاَن تُعاتِبُنی
کلّ ناسِ و انتَ عنّی راض
مغمو بدلِ خمیر ہیں یہ دیر
اپنا مطلب اور اُس سے اغماض

حق میں اپنوں کے سخت ممسک ہیں
جو کہ اوروں کے حق میں ہیں فیاض
رائے سے ہے کچھ علیل سی تیری
نبض اپنی بھی دیکھ اے نباض
وعظ ہیں گُل کترتے ہیں واعظ
منھ ہیں اُن کے زباں ہے یا مقراض
ہے فقیہوں میں اور ہم میں نزع
ہَل لَنا فی نزاعِنا من قاض
ہے ریاضت پہ ناز کیا زاہد
خارکش تجھ سے ہے سوا مُرتاض
شیخ کی تھی یہ آخری تلقیں
چاہیے زر تو اُس سے کر اعراض
ایسی غزلیں سُنی نہ تھیں حالی
یہ نکالی کہاں سے تم نے بیاض

ط

رات گذری ہو چکا دَورِ نشاط
طے ہوئی بس اب کئی دم میں بساط
دل سے خوشیاں ہو گئیں سب گوشہ گیر
نام تھا شاید جوانی کا نشاط
دن اب اے دل منقبض رہنے کے ہیں
ہو چکا ہونا تھا جو کچھ انبساط
غنچہ چٹکا اور آپہنچی خزاں
فصلِ گُل کی تھی فقط اتنی بساط
زینۂ ممبر ہے لغزش کی جگہ
جانیو واعظ اِسے راہِ صراط
تو بھی کھانے میں نہیں محتاط شیخ
ہم کریں پینے میں پھر کیوں احتیاط
کوچ کی حالی کرو تیاریاں
ہے قویٰ میں دمبدم اب انحطاط

ظ

چھپے ہیں حریفوں میں احرار واعظ
بُرا کہہ نہ رندوں کو زنہار واعظ

سدا قہر ہی قہر ہے عاصیوں پر   نہ ستّار ہے تو نہ غفّار واعظ
نکل آئیگی مے کشی کی بھی حلّت   کوئی مِل گیا گر ہمیں یار واعظ
کوئی بات دیکھی نہیں تجھ میں لیکن   سُنا ہے کہ ہوتے ہیں عیّار واعظ
ہمیں اور بھی تجھ سے کرتے ہیں بدظن   یہ جبّہ یہ ریش اور یہ دستار واعظ
نہ چھوڑے گا زیور گھر دنیں زر تو   یہی ہے اگر حسنِ گفتار واعظ
مُسلماں نہ ہم کاش حالی کو کہتے
ہوئے بات کہہ کر گنہگار واعظ

ع

اے بہار زندگانی الوداع   اے شباب اے شادمانی الوداع
اے بیاضِ صبحِ پیری السّلام   اے شبِ قدرِ جوانی الوداع
اَلسّلام اے قاصدِ ملکِ بقا   الوداع اے عمرِ فانی الوداع
روزگارِ ضعف و سستی الصّلاۃ   وقتِ سعی و جانفشانی الوداع
فرصتِ عشق و جوانی الفراق   قطعہ دَورِ عیش و کامرانی الوداع
تجکو سمجھے تھے نعیمِ جاوداں ۲   اے نعیمِ جاودانی الوداع
آ لگا حالی کنارے پر جہاز
الوداع اے زندگانی الوداع

غ

کل کبک سے چمن میں یہ کہتا تھا ایک زاغ   دیکھ اِس خرامِ ناز پہ اتنا نہ کر دماغ
ہیں تاک میں عقاب تو شہباز گھات میں   حملے سے یاں اجل کے نہیں ایکدم فراغ

یارب نگاہِ بد سے چمن کو بچائیو
بلبل بہت ہی دیکھ کے پھولوں کو باغ باغ
دو چار گام نقشِ قدم مل کے رہ گئے
آگے چلا نہ آہوئے مشکیں کا کچھ سُراغ
آئیں پئیں وہ شوق سے جو اہلِ ظرف ہیں
ساقی بھرے کھڑا ہے مئے لعل سے ایاغ
جنگل میں تختۂ گُلِ خود رو کو دیکھ کر
تازہ ہوا زمانہ کی ناقدریوں کا داغ
حالی بھی پڑھنے آئے تھے کچھ بزم شعر میں
باری تب اُنکی آئی کہ گُل ہو گئے چراغ

ف

حق نہ ملّا نے کچھ بتایا صاف
اور نہ صوفی نے کچھ دکھایا صاف
آنکھ اپنی ہی جب تلک نہ کُھلی
مہرِ روشن نظر نہ آیا صاف
کبھی دشمن سے بھی نہ کھٹکے ہم
صاف تھے آپ سب کو پایا صاف
زاہدو ہم تو تھے ہی آلودہ
تم کو بھی ہم نے کچھ نہ پایا صاف
کیوں فقیہوں سے رُک گئے **حالی**
بھید تم نے نہ کچھ بتایا صاف

ق

نہ ہم ہیں یار کی محفل میں بار کے لائق
نہ اپنا کلبۂ احزاں ہے یار کے لائق
کرے گا کیا ترا کحل الجواہر اے کحّال
نہیں یہ آنکھ ہی دیدارِ یار کے لائق
مکان عاریتی اور لباس بوسیدہ
بہت ہے زندگیِ مستعار کے لائق
غرور و حرص ہیں زیور عروسِ دنیا کے
بناؤ تھے یہی اِس نابکار کے لائق
کرے گی بادِ بہار آ کے اب کسے سرسبز
رہا نہ باغ قدمِ بہار کے لائق

بس اب ہے فضلۂ روباہ و گرگ پر گذران
رہا نہ شیر ژیاں خود شکار کے لائق

گنہ کا عذر کریں محتسب ہم آنکھوں سے
ہمارے جرم ہوں گر اعتذار کے لائق

گرہ میں دام نہ دفتر میں نام ہے حالی
تمھیں تو شہر میں ہو اعتبار کے لائق

یہ ہم نے مانا کہ تم میں ہنر بھی ہیں کچھ کچھ
مگر نہیں کوئی خوبی شمار کے لائق

ک

دلوں کا کھوٹ اگر کہیے برملا ایک ایک
تو آشنا سے ہو بیگانہ آشنا ایک ایک

سلامتی کو وہاں قافلوں کی رو بیٹھیں
جہاں ہے راہزنِ خلق رہنما ایک ایک

زمانہ پھر نظر آتا ہے کچھ ترقی پر
بنا ہے غوثِ زماں آجکل گدا ایک ایک

رہا ہوں رند بھی اے شیخ پارسا بھی میں
مری نگاہ میں ہے رند و پارسا ایک ایک

وفا کی ایک تجھی سے امید ہے اُس وقت
کہ یار یار سے ہو جائیگا جُدا ایک ایک

چھپا کے اُس سے قصور اپنے ہم بہت شرمائے
جب آپ منھ سے لگی بولنے خطا ایک ایک

ہوا نہ ایک بھی حق اُس کی بندگی کا ادا
کیا ہے جس نے حق خواجگی ادا ایک ایک

امیرِ حاج کی ہمت میں گر نہ آئے قصور
تو موجِ بحر ہے کشتی کی ناخدا ایک ایک کو

ہم آج بیٹھے ہیں ترتیب کرنے دفتر کو
ورق جب اُس کا اڑا لیگئی ہوا ایک ایک

بہار نے بھی نہ بلبل تری بجھائی آگ
جگر کے پار ہے اب بھی تری نوا ایک ایک

نہ ہم رہیں گے نہ حالی یہ دلخراش جہاں
رہیگی حالی دلگیر کی صدا ایک ایک

گ

عالم آزادگاں ہے اِک جہاں سب سے الگ
ہے زمیں اُن کی اور اُن کا آسماں سب سے الگ

پاک ہیں آلائشوں ہیں۔ بند شو نہیں بے لگاؤ
رہتے ہیں دنیا میں سب کے درمیاں سب سے الگ
دوست کے ہیں جاں نثار اپنا ہو یا بیگانہ ہو
ہے عشیرہ اور اُن کا دودماں سب سے الگ
سب کی سن لیتے ہیں لیکن اپنی کچھ کہتے نہیں
ہے کوئی بھیدی اور اُن کا رازداں سب سے الگ
جانچتے اوروں کو ہیں خود دے کے اپنا امتحاں
رکھتے ہیں اپنا طریق امتحاں سب سے الگ
کلبۂ احزاں ہے روشن اُن کا جس مہتاب سے
ہے وہ نور مہر و ماہ و کہکشاں سب سے الگ
سیکڑوں پھندے نہیں یاں جکڑا ہوا ہے بند بند
پر ٹٹولے کوئی دل اُن کا تو واں سب سے الگ
شاعروں کے ہیں سب انداز سخن دیکھے ہوئے
دردمندوں کا ہے دکھڑا اور بیاں سب سے الگ
مال ہے نایاب پر گاہک ہیں اکثر بے خبر
شہر میں کھولی ہے حالی نے دکاں سب سے الگ

صلح ہے اِک مہلتِ سامانِ جنگ
کرتے ہیں بھرنے کو یاں خالی تفنگ
عہد گیتی پر نہ بھولیں کامراں
آخر اِس کی آشتی لائے گی رنگ
علم کیا۔ اخلاق کیا۔ ہتھیار کیا
سب بشر کے مار رکھنے کے ہیں ڈھنگ
رد کیجے بد خو کو بد خوئی سے کیوں
آپ اپنی خو سے آ جائے گا تنگ
زہد و طاعت پر جوانوں کی نہ جاؤ
یہ بھی ہے اِک نوجوانی کی ترنگ
پاکبازوں کو نہیں کچھ قید وضع
جو ہیں اچھے اُن پہ سب کھلتے ہیں رنگ
کام کا شاید زمانہ ہو چکا
دل میں اب اُٹھتی نہیں کوئی ترنگ
وہ عجائب اب نظر آتے ہیں کھیل
دیکھ پہلے جن کو رہ جاتے تھے دنگ
کاہشوں سے پرورش پاتی ہے روح
اب لگا کھایا پیا سب آ کے انگ
عقل شاید ملک میں باقی ہے کچھ
ہے ابھی کم حاصلِ افیون و بنگ

بڑھ گیا ہے رحمِ انسانی بہت — ہو گی ایجاد اب نئی توپ اور تفنگ
قوم کو حالی نہیں راس اتفاق
پھوٹ ہی کا بس کھلے گا ہم پہ رنگ

ل

ہو گئے ہیں ہم ہی کچھ اور آج کل — یا زمانہ ہی گیا یا رب بدل
رہ گئے ہیں کچھ کچھ آثارِ خلف — اور ابھی ہونا ہے شاید مبتذل
اِک سنبھلتے ہم نظر آتے نہیں — ورنہ گِر گِر کر گئے لاکھوں سنبھل
کب تک آخر ٹھیر سکتا ہے وہ گھر — آگیا بنیاد میں جس کی خلل
ناؤ ڈوبے یا کہیں کھیوا ہو پار — تیری حد بھی ہے کچھ اے طولِ امل[لہ]
اب لگاؤ پود کچھ اپنی نئی — لا چکے پودے بہت اگلوں کے پھل
دیکھئے نبھتا ہے کب تک پاسِ وضع — ہم نہ بدلے اور گیا عالم بدل
کوششوں میں کچھ مزہ آتا نہیں — وقت کوشش کا گیا شاید نکل
اب سنو حالی کے نوحے عمر بھر
ہو چکا ہنگامۂ مدح و غزل

ہ

درسہ میں ہر کے رو بر قفا بیٹھے تھے ہم — اُٹھے بس ویسے ہی کورے جیسے جا بیٹھے تھے ہم
ردہی ہم ہیں کہ ہر عشوہ پہ ہیں کافر کے لوٹ — زالِ دنیا سے ابھی ہو کر خفا بیٹھے تھے ہم
بستیں اہلِ ورع کی سب گئیں نظروں سے گر — بزم رنداں میں یونہیں اک روز جا بیٹھے تھے ہم

[لہ] امل : آرزو - اُمید - ۱۲

شیخ دنیا کی حقیقت رہ گئے دُنیا میں کھُلی
ورنہ دھوکا۔ دور سے دیکھ اسکو کھا بیٹھے تھے ہم
ہم نہ تھے آگاہ واعظ زشت خوئی سے تری
آدمی تجکو سمجھ کر پاس آ بیٹھے تھے ہم
سعی کا انجام پہلے ہی سے آتا تھا نظر
ہاتھ ساحل ہی پہ بیڑے سے اُٹھا بیٹھے تھے ہم

ہم سے خود دنیا ہی پتیائی نہ حالی ورنہ یاں
دین تک دُنیا کی قیمت میں لگا بیٹھے تھے ہم

خوبیاں اپنے میں گو بے انتہا پاتے ہیں ہم
پر ہر اِک خوبی میں داغ اِک عیب کا پاتے ہیں ہم
خوف کا کوئی نشاں ظاہر نہیں افعال میں
گو کہ دل میں متصل خوفِ خدا پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں طاعت تو کچھ خواہاں نمایش کے نہیں
پر گنہ چھپ چھپ کے کرنے میں مزا پاتے ہیں ہم
دیدہ و دِل کو خیانت سے نہیں رکھ سکتے باز
گرچہ دست و پا کو اکثر بے خطا پاتے ہیں ہم
دل میں دردِ عشق نے مدت سے کر رکھا ہے گھر
پر اُسے آلودۂ حرص و ہوا پاتے ہیں ہم
ہوسکے نادم جُرم سے پھر جُرم کرتے ہیں وہی
جُرم سے گو آپ کو نادم سدا پاتے ہیں ہم
ہیں فدا اُن دوستوں پر جن میں ہو صدق و صفا
پر بہت کم آپ میں صدق و صفا پاتے ہیں ہم
گو کسی کو آپ سے ہونے نہیں دیتے خفا
اِک جہاں سے آپکو لیکن خفا پاتے ہیں ہم
جانتے اپنے سوا سب کو ہیں بے مہر و وفا
اپنے میں گر شمّۂ مہر و وفا پاتے ہیں ہم
بخل سے منسوب کرتے ہیں زمانہ کو سدا
گر کبھی توفیق ایثار و عطا پاتے ہیں ہم
ہو اگر مقصد میں ناکامی تو کر سکتے ہیں صبر
دردِ خود کامی کو لیکن بے دوا پاتے ہیں ہم
ٹھیرتے جاتے ہیں جتنے چشم عالم میں بھلے
حالِ نفسِ دوں کا اتنا ہی بُرا پاتے ہیں ہم
جسقدر جھک جھک کے ملتے ہیں بزرگ و خرد سے
کبر و ناز اتنا ہی اپنے میں سوا پاتے ہیں ہم
گو بھلائی کرکے ہمجنسوں سے خوش ہوتا ہے جی
تہ نشیں اُس میں مگر دُردِ ریا پاتے ہیں ہم

ہے ردائے نیکنامی دوش پر اپنے مگر
داغ رسوائی کے کچھ زیرِ ردا پاتے ہیں ہم
راہ کے طالب ہیں پر بے راہ پڑتے ہیں قدم
دیکھیئے کیا ڈھونڈھتے ہیں اور کیا پاتے ہیں ہم
نور کے ہمنے گلے دیکھے ہیں اے حالی مگر
رنگ کچھ تیری الاپوں میں سوا پاتے ہیں ہم

آگے بڑھے نہ قصّہ عشقِ بتاں سے ہم
سب کچھ کہا مگر نہ کھُلے رازداں سے ہم
اب بھاگتے ہیں سایہ عشقِ بتاں سے ہم
کچھ دل سے ہیں ڈرے ہوئے کچھ آسماں سے ہم
خود رفتگیِ شب کا مزا بھولتا نہیں
آئے ہیں آج آپ میں یارب کہاں سے ہم
دردِ فراق و رشکِ عدو تک گراں نہیں
تنگ آگئے ہیں اپنے دلِ شادماں سے ہم
جنت میں تو نہیں اگر اے زخمِ تیغِ عشق
بدلیں گے تجکو زندگیِ جاوداں سے ہم
لینے دو چین کوئی دم اے منکر و نکیر
آئے ہیں آج چھوٹ کے قیدِ گراں سے ہم
ہنستے ہیں اُسکے گریہ بے اختیار پر
بھولے ہیں بات کہکے کوئی رازداں سے ہم
اب شوق سے بگاڑ کی باتیں کیا کرو
کچھ پاگئے ہیں آپ کی طرزِ بیاں سے ہم
دلکش ہر ایک قطعہ صحرا ہے راہ میں
ملتے ہیں جاکے دیکھیے کب کارواں سے ہم
لذّت ترے کلام میں آئی کہاں سے یہ
پوچھیں گے جائے حالی جادو بیاں سے ہم

ن

یاروں کو تجھ سے حالی اب سرگرانیاں ہیں
نیندیں اُچاٹ دیتی تیری کہانیاں ہیں
یاد اسکی دل سے دھو دے اے چشم تر تو ہاں نوں
اب دیکھنی مجھے بھی تیری لن ترانیاں ہیں
بنتے ہیں غیر اپنے ہوتے ہی رام وحشی
اُلفت کی بھی جہاں میں کیا حکمرانیاں ہیں

غیبت ہو یا حضوری دونوں بُری ہیں تیری
جب بدگمانیاں تھیں اب بدزبانیاں ہیں
کہتے ہیں جسکو جنّت وہ اِک جھلک ہے تیری
سب واعظوں کی باقی رنگیں بیانیاں ہیں
رحمت تری غذا ہے غصّہ ترا دوا ہے
شانیں ہیں تیری جتنی جانِ جہانیاں ہیں
ہوگا تو پہلے ہوگا اے چرخ مہرباں تو
کچھ ان دنوں تو ہم پر نامہربانیاں ہیں
اپنی نظر میں بھی یاں اب تو حقیر ہیں ہم
بے غیرتی کی یارو اب زندگانیاں ہیں
روتے ہیں چار ہم پر ہنستے ہیں چار ہم پر
یہاں تک ہماری پہنچی اب ناتوانیاں ہیں
ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں ہیں خوش
حصّہ میں اب ہمارے یہ شادمانیاں ہیں
خاور سے باختر تک جن کے نشاں تھے برپا
کچھ مقبروں میں باقی اُن کی نشانیاں ہیں
دیکھا نہیں ابھی کچھ قحط الرّجال تم نے
اس سے بھی سخت آنی آگے گرانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا
کچھ کر لو نوجوانو اُٹھتی جوانیاں ہیں
فضل و ہنر بڑوں کے گر تم میں ہوں تو جانیں
گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
رونے میں تیرے حالی لذّت ہے کچھ نرالی
یہ خوں فشانیاں ہیں یا گُل فشانیاں ہیں

جب سے سُنی ہے تیری حقیقت چین نہیں اِک آن ہمیں
اب نہ سُنیں گے ذکر کسی کا آگے کو ہوئے کان ہمیں
کچھ روزوں غفلت میں پھرے یہاں ڈھونڈھتے ہم آسائش کو
کھُل گئی جب دنیا کی حقیقت کچھ نہ رہا خلجان ہمیں
چل کے نئی اِک چال فلک نے کھو دیے ہوش حریفوں کے
زد سے بچیں یا مات قبولیں اِتنے نہیں اوسان ہمیں

پاس انھیں گر اپنا ذرا ہو - جان اپنی بھی اُنپہ فدا ہو
کرتے ہیں خود نامنصفیاں اور کہتے ہیں نافرمان ہمیں

داد طلب سب غیر ہوں جب تو اُن میں کسی کا پاس نہ ہو
بتلائی ہے زمانہ نے انصاف کی یہ پہچان ہمیں

صحرا میں کچھ بکریوں کو قصّاب چَراتا پھرتا تھا
دیکھ کے اُس کو سارے تُمہارے آگئے یاد احسان ہمیں

یاں تو بدولت زہد و ورع کے نبھ گئی خاصی عزّت سے
بَن نہ پڑا پَر کل کے لیئے جو کرنا تھا سامان ہمیں

سُر تھے وہی اور تال وہی پَر راگنی کچھ بے وقت سی تھی
غُل تو بہت یاروں نے مچایا پَر گئے اکثر مان ہمیں

غیر سے اب وہ بَیر نہیں اور یار سے اب وہ پیار نہیں
بس کوئی دن کا اب حالی یہاں سمجھو تم مہمان ہمیں

کی تو ہیں ہمنے بھی حالی کوچ کی تیاریاں سوجھتی ہیں راہ میں لیکن بہت دشواریاں
خوابِ راحت میں وہ لذّت تیرے اے پیری نہیں جو جوانی میں مزا دیتی تھیں شب بیداریاں
ہیں اگر بیدردیاں اپنوں کی دل کو ناگوار ناگوار اُن سے سوا غیروں کی ہیں غمخواریاں
ہے کہیں اقبال کی نوبت کہیں ادبار کی سب کو کرنی ہونگی پوری اپنی اپنی باریاں
زیست بے عقلوں کو ہو جائے بسر کرنی محال اتنی بھی اے عاقلو اچھی نہیں ہُشیاریاں
بے مزہ ہے اہل دیں کی ترش روئی بھی اگر اِس سے پھیکی اہلِ دُنیا کی ہیں ظاہرداریاں
گو طبیعت سے گئے سب مادّے فاسد نکل کم ہوئیں حالی نہ لیکن نفس کی بیماریاں

راز دل کی سرِ بازار خبر کرتے ہیں
آج ہم شہر میں خوں اپنا ہدر کرتے ہیں
عقل کی بات کوئی ہمنے کہی ہے شاید
جتنے جتنے ہیں سب ہم سے حذر کرتے ہیں
جُرم خالق سے سوا پاتے ہیں جُرم فقہا
جب کہ ہم اپنے جُرایم پہ نظر کرتے ہیں
کم سے کم وعظ میں اتنا تو اثر ہو واعظ
بول قوّال کے جو دل میں اثر کرتے ہیں
زہد و طاعت کا سہارا انہیں جب سے واعظ
یاد اللہ کو ہم آٹھ پہر کرتے ہیں
عیب یہ ہے کہ کرو عیب ہنر دکھلاؤ
ورنہ یاں عیب تو سب فرد بشر کرتے ہیں
غمزدو رنج و مصیبت پہ کرو ناز کہ وہ
دل دُکھاتے ہیں وہی جنمیں کہ گھر کرتے ہیں
جی رکاوٹ سے جو اُنکی کبھی رک جاتا ہو
اِک لگاوٹ میں اِدھر سے وہ اُدھر کرتے ہیں
ایک یہاں جینے سے بیزار رہتے ہیں یارب
یا اسی طرح سے سب عمر بسر کرتے ہیں
تلخیاں زیست کی تھوڑی سی رہی ہیں باقی
یہ مُہم بھی جو خدا چاہے تو سر کرتے ہیں
قیصر و دارا کا یاں پیٹ تو بھرنا معلوم
بس ہماری ہی طرح وہ بھی بسر کرتے ہیں
کہیں افطار کا حیلہ تو نہ ہو یہ حالی
آپ اکثر رمضاں ہی میں سفر کرتے ہیں

دیکھنا ہر طرف نہ مجلس میں
رخنے نکلیں گے سیکڑوں اِس میں
کی نصیحت بُری طرح ناصح
اور اِک بس بلا دیا بس میں
ہو نہ بینا تو فرق پھر کیا ہے
چشمِ انسان و چشم نرگس میں
بے قدم دم ہیں خانقاہوں میں
بے عمل علم ہیں مدارس میں
دین اور فقر تھے کبھی کچھ چیز
اب دھرا کیا ہے اسمیں اور اس میں
نہ ہو قبضے میں جب عنانِ فرس
ہیچ ہیں جو ہنر ہیں فارس میں

جس سے نفرت ہی اہلِ نعمت کو   وہی نعمت ہے چشمِ مفلس میں
ہو فرشتہ بھی تو نہیں انساں   درد تھوڑا بہت نہ ہو جس میں
جانور۔ آدمی۔ فرشتہ۔ خدا   آدمی کی ہیں سینکڑوں قسمیں
آج کل چرخ صلح جو ہے بہت   دیکھیے ہو بگاڑ کس کس میں

کی ہے خلوت پسند حالی نے
اب نہ دیکھو گے اُس کو مجلس میں

بوالہوس عشق کی لذت سے خبردار نہیں   ہیں مئے ناب کے دلّال۔ قدح خوار نہیں
شہر میں اُن کے نہیں جنسِ وفا کی بکری   بھاؤ ہیں پوچھتے پھرتے پہ خریدار نہیں
کون سے وہ گلِ رعنا پہ نواسنج نہیں   کون سی نرگسِ شہلا کے وہ بیمار نہیں
کبھی لیلیٰ پہ ہیں مفتوں کبھی شیریں پہ فدا   اور جو پھر دیکھو تو دونوں سے سروکار نہیں
اُٹھ نہیں سکتی سزا جرمِ وفا کی اُن سے   دل پھنسا کر کہیں بنتے وہ گنہ گار نہیں
عیش میں جان فدا کرنے کو تیار ہیں وہ   اور جو ہو کُل کا کھٹکا بھی تو پھر یار نہیں
نت نیا ذائقہ چکھنے کا ہے لپکا اُن کو   دربدر جھانکتے پھرنے سے اُنہیں عار نہیں
بوالہوس کام طلب بندۂ نفس اہلِ ہوائی   ایک عالم ہی اسی رنگ میں دو چار نہیں
دعوئ عشق و محبت پہ نہ جانا اُن کے   اُن میں گفتار ہی گفتار ہے کردار نہیں

کہے حالی بھی اگر عاشقِ صادق ہوں میں
کہہ دو واللہ کہ صادق نہیں زنہار نہیں

پھونکا ہی فصلِ گُل نے صور آکے پھر چمن میں   اِک حشر سا ہے برپا مرغانِ نغمہ زن میں
بُلبل کے آگ سی کچھ تن من میں لگ رہی ہے   بجلی گری فلک سے یا گُل کِھلا چمن میں

بادِ صبا گئی پھونک کیا جانے کان میں کیا — پھولے نہیں سماتے غنچے جو پیرہن میں
چپ ہے زبانِ سوسن حیراں ہے چشمِ نرگس — قدرت کا دیکھ جلوہ نسرین و نسترن میں
ہیں اور تو ادائیں ساری بھی تندوں کی — پڑتی ہے جان باقی بس سرو و نارون میں
ہے عیدِ اہلِ اسلام یا موسمِ بہار ال — جنگل بسا ہوا ہے سب عطرِ یاسمن میں
منہ سے دھواں سا اٹھا لیتے ہی نام اسلام — بارود بچھ رہی تھی گویا لب و دہن میں
پھر زخم پھوٹ نکلا حالی نہ چھیڑنا تھا — فصلِ خزاں کا قصہ ذکرِ گل و سمن میں
گو رو چکے ہیں دکھڑا سو بار قوم کا ہم — پر تازگی وہی ہے اِس قصۂ کہن میں
وہ قوم جو جہاں میں کل صدرِ انجمن تھی — تم نے سنا بھی؟ اُس پر کیا گذری انجمن میں
پائینِ بزم بھی اب ملتی نہیں اِسے جا — روندن میں ہے وہ گلبن پھولا تھا جو چمن میں
ردیہ کی جون میں ہے مرعوب اب وہ ملت — تھی سہمناک کل تک جو شیر کے بدن میں
وہ دن گئے کہ حکمت تھی مستندِ یمن[۱] کی — ہے اب بجائے حکمت خاک اڑ رہی یمن میں
وہ دِن گئے کہ موتی مشہور تھے عدن کے — ہے کال موتیوں کا اب سر بسر عدن میں
تیرِ اویس پر ہے بس فخر اب قرن کو — زندہ اویس کوئی باقی نہیں قرن میں
اِس باغ کی خزاں نے کچھ خاک سی اڑا دی — فصلِ بہار گویا آئی نہ تھی چمن میں
ڈالی نہ ہوگی آگے اسے ندیہ چرخ شاید — جو اب کے تو نے ہلچل ڈالی ہے انجمن میں
فوج اور رہبر دونوں پھرتی ہیں بے سری سی — گویا امیرِ لشکر مارا گیا ہے رن میں
خرد و بزرگ سارے ہیں بدحواس گویا — لٹنے کی قافلے کے پہنچی خبر وطن میں

---

[۱] یمن کی نسبت حدیث میں آیا ہے اَلْاِیمَانُ یَمَانٍ وَالْحِکْمَۃُ یَمَانِیَۃٌ یعنی ایمان ہے تو یمن کا ہے اور حکمت ہے تو یمن کی ہے۔ اسی پر میر باقر داماد مرحوم نے اپنے فلسفہ کا نام حکمت یمانیہ رکھا ہے۔ ۱۲

بھولی ہوئی ہیں ڈاریں ہرنوں کی چوکڑی سب
جائیں کدھر کہ ہر سو ڈوں[۱] لگ رہی ہے بن میں
حالی بس اب نہیں یاں سننے کی تاب باقی
مانا کہ ہے بہت کچھ وسعت ترے سخن میں

نوکِ زباں نے تیری سینوں کو چھید ڈالا
ترکش میں ہے یہ پیکاں یا ہے زباں دہن میں

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں
اب ٹھیرتی ہے دیکھیے جا کر نظر کہاں ق
ہیں دورِ جامِ اوّلِ شب میں خودی سے دور
ہوتی ہے آج دیکھیے ہم کو سحر کہاں
یارب اس اختلاط کا انجام ہو بخیر
تھا اُس کو ہم سے ربط مگر اس قدر کہاں
اِک عمر چاہیے کہ گوارا ہو نیشِ عشق
رکھی ہے آج لذّتِ زخمِ جگر کہاں
بس ہو چکا بیاں کسل و رنج راہ کا
خط کا مرے جواب ہے اے نامہ بر کہاں
کون و مکاں سے ہے دلِ وحشی کنارہ گیر
اِس خانماں خراب نے ڈھونڈا ہے گھر کہاں
ہم جس پہ مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور
عالم میں تجھ سے لاکھ سہی تو مگر کہاں
ہوتی نہیں قبول دُعا ترکِ عشق کی
دل چاہتا نہ ہو تو زباں میں اثر کہاں

حالی نشاطِ نغمہ و مے ڈھونڈتے ہو اب
آئے ہو وقتِ صبح رہے رات بھر کہاں

پیا ہمنے نہ جامِ بے کدورت بزمِ دوراں میں
خزاں کو لے گئے ہمراہ اگر پہنچے گلستاں میں ق
نہیں کچھ منحصر وابستگی زلفِ پریشاں میں
جو دل چاہے تو اُلجھے ایک غبار رہ بیاباں میں
اگر چھوڑا کمندِ جذبۂ عشق زلیخا نے
نہ رہنے دیگا حُسنِ خود نما یوسف کو کنعاں میں
تصوّر نے بھلایا تیرے ذوقِ شادی و غم کو
نہ کچھ کلفت ہے زنداں میں نہ کچھ راحت شبستاں میں

---

[۱] ڈوں۔ آگ کی لپٹ۔ شعلے ۱۲۰

خوشی میں بھی نہیں رہنا خوش آتا ایک حالت پر   کہاں تک جی نہ گھبرائے الٰہی دردِ ہجراں میں
زباں تقریر سے قاصر قلم تحریر سے عاجز   نہ پوچھو ہم سے کیا دیکھا ہی ہم نے بزمِ رنداں میں
فلک سی جیتے جی معلوم ملنا کامِ دل اے خضر   سوائے طولِ حسرت کیا دھرا ہی آبِ حیواں میں
نہ چھوڑیگی محبت یار سے ناکام عاشق کو   نسیمِ مصر کو آنا ہی اک دن بیتِ احزاں میں
گل و نسریں تو کیا فرقت میں جی تک چھوٹے جاتا ہی   ہمارا بھی کبھی لگتا تھا دل سیرِ گلستاں میں
بہت دن چاہئیں یوسف کو تا پہنچے زلیخا تک   نکل کر چاہِ کنعاں سی ابھی رہنا ہی زنداں میں
نہ دی حیرت نے حالی فرصتِ سیرِ جہاں اکدم
رہے ہم شہر میں ایسے کہ تھے گویا بیاباں میں

ق اب وہ اگلا سا التفات نہیں   جس پہ بھولے تھے ہم وہ بات نہیں
مجکو تم سے[1] پہ اعتماد و وفا   تم کو مجھ سے پر التفات نہیں
رنج کیا کیا ہیں ایک جاں کے ساتھ   زندگی موت ہے حیات نہیں
یوہی گذرے تو سہل ہے لیکن   فرصتِ غم کو بھی ثبات نہیں
کوئی دل سوز ہو تو کیجے بیاں   سرسری دل کی واردات نہیں
ذرّہ ذرّہ ہے مظہرِ خورشید   جاگ اے آنکھ دن ہی رات نہیں
قیس ہو کوہکن ہو یا حالی
عاشقی کچھ کسی کی ذات نہیں

ق کچھ ہنسی کھیل سنبھلنا غمِ ہجراں میں نہیں   چاک دل میں ہی مرے جو کہ گریباں میں نہیں
کھو دیا اس نے ذوقِ خلشِ فکرِ وصال   ہاں اک مزا تھا سو وہ اب کاوشِ پنہاں میں نہیں

---

[1] یعنی تم جیسے آدمی پر - ۱۲

ہم نے کی سیرِ چمن غور سے اے بلبلِ زار
بات چبھتی ہوئی کوئی گل و ریحاں میں نہیں
عشق نے مصر میں سو بار زلیخا سے کہا
فتنۂ دہر ہے جو حسن وہ کنعاں میں نہیں
محتسب صدق و صفا یاں ہیں انھیں کے دم تک
مصلحت برہمیِ صحبتِ رنداں میں نہیں
یاں بھی ہیں کون و مکاں سے دلِ وحشی آزاد
جس کو ہم قید سمجھتے ہیں وہ زنداں میں نہیں
ٹھیرتے ٹھیرتے دل یونہی ٹھہر جائے گا
بات جو آج ہے وہ کل غمِ ہجراں میں نہیں
کس طرح اسکی لگاوٹ کو بناوٹ سمجھوں
خط میں لکھا ہے وہ القاب جو عنواں میں نہیں
دی ہے واعظ نے کن آداب کی تکلیف نہ پوچھ
ایسے الجھاؤ ترے کاکلِ پیچاں میں نہیں
آدمی ہو تو کبھی پاسِ محبت کے نہ جائے
اب بھی کہتے ہیں کہ ہم غیر کے نقصاں میں نہیں
بے قراری تھی سب امیدِ ملاقات کے ساتھ
اب وہ اگلی سی درازی شبِ ہجراں میں نہیں
حالیِ زار کو کہتے ہیں کہ ہے شاہد باز
یہ تو آثار کچھ اس مردِ مسلماں میں نہیں

غمِ فرقت ہی میں مرنا ہو تو دشوار نہیں
شادیِ وصل بھی عاشق کو سزاوار نہیں ق
خوبروئی کے لئے زشتیِ خو بھی ہے ضرور
سچ تو یہ ہے کہ کوئی تجھ سا طرحدار نہیں
قول دینے میں تامل نہ قسم سے انکار
ہم کو سچا نظر آتا کوئی اقرار نہیں
کل خرابات میں ایک گوشہ سے آتی تھی صدا
دل میں سب کچھ ہے مگر رخصتِ گفتار نہیں
حق ہوا کس سے ادا اس کی وفاداری کا
جس کے نزدیک جفا باعثِ آزار نہیں
دیکھتے ہیں کہ پہنچتی ہے وہاں کونسی راہ
کعبہ و دیر سے کچھ ہم کو سروکار نہیں
ہوں گے قائل وہ ابھی مطلعِ ثانی سن کر
جو تعلی میں یہ کہتے ہیں کہ تکرار نہیں

ہیں تو ہیں غیر کو مرنے سے اب انکار نہیں
اک قیامت ہے ترے ہاتھ میں تلوار نہیں
کچھ پتا منزلِ مقصود کا پایا ہم نے
جب یہ جانا کہ ہمیں طاقتِ رفتار نہیں
چشمِ بد دور بہت پھرتے ہیں اغیار کیساتھ
غیرتِ عشق سے اب تک وہ خبردار نہیں
ہو چکا ناز اُٹھانے میں ہے گو کام تمام
للہ الحمد کہ باہم کوئی تکرار نہیں
مدّتوں رشک نے اغیار سے ملنے نہ دیا
دل نے آخر یہ دیا حکم کہ کچھ عار نہیں
اصل مقصود کا ہر چیز میں ملتا ہے پتا
ورنہ ہم اور کسی شے کے طلبگار نہیں
بات جو دل میں چھپائے نہیں بنتی حالی
سخت مشکل ہے کہ وہ قابلِ اظہار نہیں

وحشت میں تھا خیالِ گُل و یاسمن کہاں
لائی ہے بوئے اُنس نسیمِ چمن کہاں
ہے بندگی کے ساتھ یہاں ذوقِ دید بھی
جائے گا دیر چھوڑ کے اب برہمن کہاں
اہلِ طریق جس کو سمجھتے ہیں زادِ راہ
واں دخل دستبُرد کو اے راہزن کہاں
فصلِ خزاں کمیں میں ہے صیّاد گھات میں
مُرغِ چمن کو فرصتِ سیرِ چمن کہاں
لاتا ہے دل کو وجد میں اِک حرفِ آشنا
لیجائے ہم کو دیکھیے ذوقِ سخن کہاں
جی ڈھونڈھتا ہے بزمِ طرب میں اُنھیں مگر
وہ آئے انجمن میں تو پھر انجمن کہاں
دل ہو گیا ہے لذّتِ غربت سے آشنا
اب ہم کہاں ہوائے نشاطِ وطن کہاں
کہتا ہے خیر ہم بھی سہی دشمن آپ کے
شکوے کو لے گیا ہے وہ بیدادفن کہاں
روکا بہت کل آپ کو حالی نے واں مگر
جاتا ہے محوِ شوق کا دیوانہ پن کہاں

ق
کوئی محرم نہیں ملتا۔ جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

قفس میں جی نہیں لگتا کسی طرح   لگا دو آگ کوئی آشیاں میں
کوئی دن بوالہوس بھی شاد ہولیں   دھرا کیا ہے اشاراتِ نہاں میں
کہیں انجام آ پہنچا وفا کا   گھلا جاتا ہوں اَب کے امتحاں میں
نیا ہے لیجئے جب نام اُس کا   بہت وسعت ہے میری داستاں میں
دلِ پُر درد سے کچھ کام لوں گا   اگر فرصت ملی مجکو جہاں میں

بہت جی خوش ہوا **حالی** سے مل کر
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

و

مرے دل میں ہو گو مجھ سے نہاں ہو   مجھے بھی ڈھونڈ لینا تم جہاں ہو
نہ چھیڑوں تذکرہ وصلِ عدو کا   اگر سمعِ مبارک پر گراں ہو
تقاضائے محبت ہے وگرنہ   مجھے اور جھوٹ کا تم پر گماں ہو
بہت بے قدر ہوں محفل میں تیری   کہیں ناخواندہ تو بھی مہماں ہو
مجھے ڈالا ہے سو وہم و گماں میں   بہت کیوں آج مجھ پر مہرباں ہو
کمر خوں پر ہمارے باندھ رکھے   جسے سننی ہماری داستاں ہو

مؤثر ہے بہت **حالی** ترا وعظ
کل اُسکے سامنے بھی کچھ بیاں ہو

حکم ہے پیرِ مغاں کا کہ جوانی نہ گنواؤ   خیر کفارۂ عصیاں ہے یہ ہو اور پلاؤ
دل کو کس طرح سمجھیے کہ وہی ہے یہ دل   وہ اُمیدیں ہیں نہ ارماں وہ اُمنگیں ہیں نہ چاؤ
یار کو یار سمجھتا ہے نہ تو غیر کو غیر   تو تو اچھا ہے مگر تیرے بُرے ہیں برتاؤ

دوست ہوں جسکے ہزاروں وہ کسی کا نہیں دوست
سچ بتا تجکو کسی سے بھی ہے دنیا میں لگاؤ
تو وہی برق جہاں سوز ہے مَن خواہ نہ مَن
ہے برابر ترا بے ساختہ پن اور بناؤ
ایک ہی دوست اور اُس سے ہمیں چھوڑاتے ہو
ناصحو اب تمھیں دشمن کہیں یا دوست بتاؤ
ہوگیا ذکرِ قیامت تو اجیرن واعظ
باتیں کچھ اور کرو قصّہ کوئی اور سناؤ
تجکو اے اَبرِ بلا دیکھ کے جی چھوٹ گیا
ایک ہی بار تم اے بادلو اس طرح نہ چھاؤ
پہنچ اے خضر کہ ہے وقت مددگاری کا
ڈگمگاتی ہے بہت دیر سے منجدھار میں ناؤ
دیکھیں کس طرح نہ سرسبز ہو پھر کِشتِ اُمید
آؤ اور ندیاں آج آنسوؤں کی مِل کے بہاؤ
اے شرافت تجھے بکنا ہے اگر مفت تو بک
آج کل کیجیے کیا ہے یہی بازار کا بھاؤ
قافلے ساتھ کے جا پہنچے حرم کے لگ بھگ
وقت اب ہاتھ سے جاتا ہی جو آتے ہو تو آؤ

اُس کے نالوں نے کیا بزم کو آخر بے لطف
ہم نہ کہتے تھے کہ حالی کو نہ محفل میں بلاؤ

ھ

درِ فیض حق بند جب تھا نہ اب کچھ
فقیروں کی جھولی میں ہے اب بھی سب کچھ
ہر اک کو نہیں ملتی یاں بھیک زاہد
بہت جانچ لیتے ہیں۔ دیتے ہیں تب کچھ
کچھ اور آؤ بن کر تم اے میر و مرزا
نہیں پوچھتے یاں حسب اور نسب کچھ
یہ طبلِ تہی ہیں جو بنکارتے ہیں
جنھیں کچھ خبر ہے وہ کہتے ہیں کب کچھ
دیا تو نے یاں جس بہانے سے چاہا
ہنر کام آیا نہ علم و ادب کچھ
ہے افسردہ مجلس کی خسّت سے واعظ
وہ گرمائے گا یہ پسیجیں گے جب کچھ
تم اپنی سی کہتے تھے جو کہہ چکے سب
نہیں ناصحو تم پہ الزام اب کچھ

یہ ہے میر مجلس کہ چینی کی مورت   ٹٹولو تو ہیچ اور دیکھو تو سب کچھ
کوئی لقمۂ چرب تاکا ہے شاید
یہ حالی کی عزلت نہیں بے سبب کچھ

بڑھاؤ نہ آپس میں ملّت زیادہ   مبادا کہ ہو جائے نفرت زیادہ
تکلّف علامت ہے بیگانگی کی   نہ ڈالو تکلّف کی عادت زیادہ
کرو دوستو پہلے آپ اپنی عزّت   جو چاہو کریں لوگ عزّت زیادہ
نکالو نہ رخنے نسب میں کسی کے   نہیں اس سے کوئی رذالت زیادہ
کرو علم سے اکتسابِ شرافت   نجابت سے ہے یہ شرافت زیادہ
فراغت سے دنیا میں دم بھر نہ بیٹھو   اگر چاہتے ہو فراغت زیادہ
جہاں رام ہوتا ہے میٹھی زباں سے   نہیں لگتی کچھ اس میں دولت زیادہ
مصیبت کا ایک اِک سے احوال کہنا   مصیبت سے ہے یہ مصیبت زیادہ
کرو ذکر کم اپنی داد و دہش کا   مبادا کہ ثابت ہو خسّت زیادہ
پھر اوروں کی تکتے پھروگے سخاوت   بڑھاؤ نہ حد سے سخاوت زیادہ
کہیں دوست تم سے نہ ہو جائیں بدظن   جتاؤ نہ اپنی محبّت زیادہ
جو چاہو فقیری میں عزّت سے رہنا   نہ رکھو امیروں سے ملّت زیادہ
وہ افلاس اپنا چھپاتے ہیں گویا   جو دولت سی کرتے ہیں نفرت زیادہ
نہیں چھپتے عیب اتنی ثروت سی تیرے   خدا دے تجھے خواجہ ثروت زیادہ
ہی اُلفت بھی وحشت بھی دنیا سی لازم   پہ اُلفت زیادہ نہ وحشت زیادہ
فرشتہ سے بہتر ہی انسان بننا   مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

بکے مفت یاں ہم زمانہ کے ہاتھوں   پہ دیکھا تو تھی یہ بھی قیمت زیادہ
ہوئی عمر دنیا کے دھندوں میں آخر   نہیں بس اب اے عقل مہلت زیادہ

غزل میں وہ رنگت نہیں تیری حالی
الاپیں نہ بس آپ دُھرپت زیادہ

حقیقت محرمِ اسرار سے پوچھ   مزا انگور کا مے خوار سے پوچھ
وفا اغیار کی اغیار سے سُن   مری اُلفت در و دیوار سے پوچھ
ہماری آہ بے تاثیر کا حال   کچھ اپنے دل سے کچھ اغیار سے پوچھ
دلوں میں ڈالنا ذوقِ اسیری   کمند گیسوے خمدار سے پوچھ
دلِ مہجور سے سُن لذّتِ وصل   نشاطِ عافیت بیمار سے پوچھ
نہیں جز گریۂ غم حاصلِ عشق   ہماری چشم دریا بار سے پوچھ
نہیں آبِ بقا جز جلوۂ دوست   کسی لب تشنۂ دیدار سے پوچھ
فریبِ وعدۂ دلدار کی قدر   شہیدِ خنجرِ انکار سے پوچھ
فغانِ شوق کو مانع نہیں وصل   یہ نکتہ عندلیبِ زار سے پوچھ
تصوّر میں کیا کرتے ہیں جو ہم   وہ تصویرِ خیالِ یار سے پوچھ

متاعِ بے بہا ہے شعرِ حالی
مری قیمت مری گفتار سے پوچھ

ی

ہے اُن کی دوستی پہ ہم کو تو بدگمانی   وہ ہم کو دوست سمجھیں یہ اُن کی مہربانی
بے جرم کوئی آخر کب تک سُنے ملامت   ناصح سے ہم کو اپنی کہنی پڑی کہانی

عاشق کے دل کو ٹھنڈک جو تیری آگ میں ہے   دیتا نہیں وہ لذّت پیاسے کو سرد پانی
اُمید وصل سے ہے کچھ جی چھڑائے دیتا   جو کچھ سُنا ہے ہم نے مشّاطہ کی زبانی
ہر حکم پر ہوں راضی ہر حال میں رہیں خوش   کچھ ہے اگر تو یہ ہے دنیا میں شادمانی
صبر و سکوں سے ہم کو یہ بھی نہ ٹھیرنے دے   تھوڑی سی رہ گئی ہے اے کاہش نہانی
پھر یہ بنائے ہستی ہے تیرے بعد ویراں   ہے تو بھی اب غنیمت اے ضعف و ناتوانی
دیکھا جمالِ جاناں آنکھوں نے اور دل نے   کیا جانے کس ادا سے کی اُس نے دلستانی
اِک نکتہ کے بیاں سے سر بر نہ ہو گے حالی
چلتا نہیں کسی کا یاں لافِ نکتہ دانی

کہدو کوئی ساقی سے کہ ہم مرتے ہیں پیاسے   گر مے نہیں دے زہر ہی کا جام بلا سے
جو کچھ ہے سو ہے اُس کے تغافل کی شکایت   قاصد سے ہے تکرار نہ جھگڑا ہے صبا سے
دلالہ نے اُمید دلائی تو ہے لیکن   دیتے نہیں کچھ دل کو تسلّی یہ دلاسے
ہے وصل تو تقدیر کے ہاتھ اے شہ خوباں   یاں ہیں۔ تو فقط تیری محبّت کے ہیں پیاسے
پیاسے ترے سرگشتہ ہیں جو راہِ طلب میں   ہونٹوں کو وہ کرتے نہیں تر آبِ بقا سے
درگذرے دوا سے تو بھروسہ ہے دُعا کے   درگذریں دعا سے بھی دعا ہے یہ خُدا سے
ایک درد ہو بس آٹھ پہر دل میں کہ جس کو   تخفیف دوا سے ہو نہ تسکین دُعا سے
حالی دلِ انساں میں ہے گم دولت کونین   شرمندہ ہوں کیوں غیر کے احسان و عطا سے
جب وقت پڑے دیجیے دستک درِ دل پر
جُھکیے فقرا سے نہ جھپکیے اُمرا سے

کبک و قمری میں ہے جھگڑا کہ چمن کس کا ہے   کل بتا دے گی خزاں یہ کہ وطن کس کا ہے

فیصلہ گردشِ دوراں نے کیا ہے سو بار
مرو کس کا ہے بدخشان و ختن کس کا ہے

دم سے یوسفؑ کے جب آباد تھا یعقوب کا گھر
چرخ کہتا تھا کہ یہ بیتِ حزن کس کا ہے

مطمئن اس سے مسلماں نہ مسیحی نہ یہود
دوست کیا جانیے یہ چرخِ کہن کس کا ہے

واعظ اک عیب سے تو پاک ہے یا ذاتِ خدا
ورنہ بے عیب زمانہ میں چلن کس کا ہے

آج کچھ اور دنوں سے ہے سوا استغراق
عزمِ تسخیر پھر اے شیخِ زمن کس کا ہے

آنکھ پڑتی ہے ہر اک اہلِ نظر کی تم پر
تم میں روپ اے گل و نسرین و سمن کس کا ہے

عشق اُدھر عقل اِدھر دھن میں چلے ہیں تیری
رستہ اب دیکھیے دونوں میں کٹھن کس کا ہے

شان دیکھی نہیں گر تو نے چمن میں اُس کی
ولولہ تجھ میں یہ اے مُرغِ چمن کس کا ہے

ہیں فصاحت میں مُثل واعظ و حالیؔ دونو
دیکھنا یہ ہے کہ بے لاگ سخن کس کا ہے

ہوا کچھ اور ہی عالم میں چلتی جاتی ہے
ہُنر کی عیب کی صورت بدلتی جاتی ہے

عجب نہیں کہ رہے نیک و بد میں کچھ نہ تمیز
کہ جو بدی ہے وہ سانچے میں ڈھلتی جاتی ہے

سیاہ و میر سپہ باغ باغ ہیں لیکن
بھیر[1] روتی ہے اور ہاتھ ملتی جاتی ہے

کہا جو میں نے وفا کرتے آئے ہیں احباب
کہا زمانہ کی عادت بدلتی جاتی ہے

قلق انھیں نہیں گر دوستوں سے چھٹنے کا
طبیعت اپنی بھی کچھ کچھ سنبھلتی جاتی ہے

بہت سے کھو دیے خلجان بینوائی نے
ضرورت ایک کے بعد ایک ٹلتی جاتی ہے

ہوئے ہیں بارِ امانت سے تیرے سب عاجز
زمیں بھی اپنے خزانے اُگلتی جاتی ہے

اُڑے گی خاک تقدس کی اب سرِ بازار
فقیہ و شیخ میں جوتی اُچھلتی جاتی ہے

---

[1] بھیر: فوجی چھاؤنی کے وہ لوگ جو بہ سلسلۂ تجارت وہاں رہتے ہوں۔

نہ خوف مرنے سے جب تھا نہ اب ہی کچھ حالی
کچھ اِک جھجک تھی سو وہ بھی نکلتی جاتی ہے

بری اور بھلی سب گذر جائے گی — یہ کشتی یونہیں پار اُتر جائے گی
ملے گا نہ گلچیں کو گل کا پتا — ہر ایک پنکھڑی یوں بکھر جائے گی
رہیں گے نہ ملاح یہ دِن سدا — کوئی دن میں گنگا اُتر جائے گی
اِدھر ایک ہم اور زمانہ اُدھر — یہ بازی تو سو بسوے ہر جائے گی
بناوٹ کی شیخی نہیں رہتی شیخ! — یہ عزت تو جائے گی پر جائے گی
نہ پوری ہوئی ہیں اُمیدیں نہ ہوں — یونہی عمر ساری گذر جائے گی
سنیں گے نہ حالی کی کب تک صدا
یہی ایک دن کام کر جائے گی

سلف کی دیکھ رکھو راستی اور راست اخلاقی — کہ اُنکے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی
نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن — حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاقی
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں — یہ گلچینی ہے یا لُٹّس ہے گلچیں یا ہے قزّاقی
کمالِ کفش دوزی علم افلاطوں سے بہتر ہے — یہ وہ نکتہ ہے سمجھے جس کو مشائی نہ اشراقی
رہی دانائی آخر غالب آکر پہلوانی پر — گئے چھپ مان سب چینی و فرغانی و قبچاقی
ہمارے ظرف ہی انعام کے قابل نہیں ورنہ — لنڈھائے خم پہ خم غیروں پہ کیوں ممسک ہو کر ساقی
ایچ کوشش و تدبیر کے سب ہو چکے حالی
لطیفہ رہ گیا ہے دیکھنا اِک غیب کا باقی

اہلِ معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی — بزم میں اہلِ نظر بھی ہیں تماشائی بھی

اپنے اور غیر کے حق کی نہیں کچھ رکھتے تمیز   اِس میں شہری بھی ہیں کوہی بھی ہیں صحرائی بھی
آنکھ سب ایک کھلی رکھتے ہیں اور ایک مُندی   اِس میں مسلم بھی ہیں ہندو بھی ہیں عیسائی بھی
جو چھپاتے ہیں حق اندیشۂ رُسوائی سے   گھات میں اُن کی لگی بیٹھی ہے رُسوائی بھی
دوست گر بھائی نہ ہو دوست ہی تو بھی لیکن   بھائی گر دوست نہیں تو نہیں کچھ بھائی بھی
اے غم دوست تجھی پر نہیں اپنی گذران   کچھ فتوح[1] اِس کے سوا اور ہے بالائی بھی
دل غنی رکھتے ہیں اے دولتِ دُنیا جو لوگ   تیور اُن کے کبھی تو دیکھ کے شرمائی بھی
عقل ہی- اپنی حماقت کے چھپانے کی نہیں آئیں   جن میں کچھ ساتھ حماقت کے ہے خود آرائی بھی
عقل اور حسن پہ جن کے بھری مجلس ہو گواہ   اُن کو خود رائی بھی پھبتی ہے خود آرائی بھی
ملنے دیگی نہ اَجل تم سے ہمیں جی بھر کر   فرصت اے دوستو دُنیا سے اگر پائی بھی

جی گئے ہم - پہ رہے مُردوں[2] سے بدتر حالی
دیکھ لی ہم نے طبیبوں کی مسیحائی بھی

رہا کھل کے زاہد کا زہد ریائی   بنائی بہت بات پر بن نہ آئی
بُرائی ہی رندوں میں بھی یہ شیخ لیکن   کہاں یہ بُرائی کہاں وہ بُرائی
گناہوں سے بچنے کی صورت نہیں جب   عبادت میں کیوں جان ناحق کھپائی
رُکا ہاتھ جب بن گئے پارسا تم   نہیں پارسائی یہ ہے نارسائی
بڑا آپ کو وہ سمجھتا ہے ہم سے   سوا اِس کے منعم میں ہے کیا بُرائی
جو کہیئے تو جھوٹی جو سُنیئے تو سچی   خوشامد بھی ہم نے عجب چیز پائی

---

[1] یعنی غم دنیا و غم زن و فرزند وغیرہ ۱۲-

[2] اپنے دائم المریض ہونے کی طرف اشارہ ہے ۱۲-

ہوئی آ کے پیری میں قدرِ جوانی   سمجھ ہم کو آئی پہ نا وقت آئی
وہی جو کہ کرتا ہے رائی کو پربت   وہ پربت کو بھی کر دکھاتا ہے رائی
جوانی میں عاشق تھے اب ہم ہیں ناصح   جو واں دل پہ لی تھی تو یاں مُنھ کی کھائی

قیاس آپ پر سب کو کرتے ہو **حالی**
نہیں اب بھی اچھوں سے خالی خُدائی

وصل کا اُس کے دلِ زار تمنائی ہے   نہ ملاقات ہے جس سے نہ شناسائی ہے
قطعِ اُمّید نے دل کر دیئے یکسو صد شکر   شکل مدّت میں یہ اللہ نے دکھلائی ہے
قوتِ دستِ خدائی ہے شکیبائی میں   وقت جب آکے پڑا ہے یہی کام آئی ہے
ڈر نہیں غیر کا۔ جو کچھ ہے سو اپنا ڈر ہے   ہم نے جب کھائی ہے اپنے ہی سے زک کھائی ہے
نشہ میں چور نہ ہوں جھانجھ میں مخمور نہ ہوں   پند یہ پیرِ خرابات نے فرمائی ہے
نظر آتی نہیں اب دل میں تمنّا کوئی   بعد مدّت کے تمنّا مری بر آئی ہے

بات سچی کہی اور اُنگلیاں اُٹھیں سب کی
سچ میں **حالی** کوئی رسوائی سی رسوائی ہے

اتنی ہی دشوار اپنے عیب کی پہچان ہے   جس قدر کرنی ملامت اور کو آسان ہے
سامنا ہے موت کا ہونا محبت سے دوچار   آئے اِس میدائیں زاہد اگر کچھ جان ہے
دیکھ اے بُلبل ذرا گلبن کو آنکھیں کھول کر   پھول میں گر آن ہی کانٹے میں بھی اک شان ہے
عقل پھیلی پر نہ سمٹی حرص و آز انسان کی   لے نہ اب نام آدمیت کا اگر انسان ہے
چیونٹیوں میں اتحاد اور مکھیوں میں اتفاق   آدمی کا آدمی دشمن خدا کی شان ہے
تجھ میں جوت اے شمع ہے کس برقِ عالم سوز کی   جان و دل سے تجھ پہ پروانہ جو یوں قربان ہے

دل میں حالی کے رہے باقی نہ بس ارمان کچھ
جی میں ہے کچھ اب اگر باقی تو یہ ارمان ہے

تم میں وہ سوز نہ تم میں ہے وہ ایماں باقی
رہ گیا کیا ہے اب اے گبر و مسلماں باقی
بزمِ دعوت میں رسائی ہوئی اپنی اُس وقت
میزباں جب نہ رہا کوئی نہ مہماں باقی
حق ادا اِک نگہِ لطف کا ہوگا کیونکر
دل و دیں لے چکے اور ہے ابھی احساں باقی
ظاہرا درد ہی اُلفت کا نہیں چارہ پذیر
ورنہ چھوڑا نہیں ہم نے کوئی درماں باقی
توشہ موجود ہے حالی نہ سواری نہ رفیق
ابھی کرنے ہیں بہت کوچ کے ساماں باقی

جب یہ کہتا ہوں کہ بس دنیا پہ اب تُف کیجیے
نفس کہتا ہے ابھی چندے توقف کیجیے
واں رسائی ہی صبا کی اور نہ قاصد کو ہے بار
اُس سے آخر کس طرح پیدا تعارف کیجیے
ضبط کیجیے دردِ دل تو ضبط کی طاقت نہیں
اور کھلا جاتا ہے رازِ دل اگر اُف کیجیے
دوست ہو یا تم ہر رنگ میں پہچانتے
بے تکلف بیٹھیے ہم سے یا تکلف کیجیے
جبکہ عقبیٰ مل گئی دنیا ہی بھر سہل الوصول
چاہیے اک عمر بھر بیٹھے تاسف کیجیے
توبہ حضرت کی یونہیں اک دودھ کا سا ہے اُبال
ہم دکھا دیں گے ذرا دم بھر توقف کیجیے

[illegible]

فکرِ فردا کی گلے پڑ گئی عادت کیسی
جان کو ہم نے لگا لی ہے یہ علت کیسی
جب خزاں ہو گئی آخر تو رہا بیمِ خزاں
جن کی قسمت میں ہو کلفت انھیں راحت کیسی
جی لگا الفت کو سمجھے تھے ہم اِک بہلاوا
وہ تو آفت تھی ہمارے لیے اُلفت کیسی
جیتے جی رکھ نہ فراغت کی توقع ناداں
قیدِ ہستی میں مری جان فراغت کیسی

عیب جوئی سے نہیں خلق کی دم بھر فارغ　　جن کو کچھ کام نہیں یاں اُنھیں فرصت کیسی
جو حقیقت سے ہیں آگاہ تری اے دنیا　　وہ نہیں جانتے ہوتی ہے مصیبت کیسی
جانتا ہے وہی۔ دل پر ہی گذرتی جس کے　　ہم کہیں کس سے کہ درپیش ہے حالت کیسی
ہم نے اوّل سے پڑھی ہے یہ کتاب آخر تک　　ہم سے پوچھے کوئی ہوتی ہے محبت کیسی
جبکہ رہتا نہیں قابو میں دل اپنے ناصح　　وحی بھی کام نہیں کرتی نصیحت کیسی
نظر آتا تھا یہ پہلے ہی سے **حالی** انجام
یارکی میں بھی کہوں ہے یہ عنایت کیسی

سعی سے بہتر تن آسانی مری　　کُفر سے بدتر مُسلمانی مری
تھا نہ محتاجِ سببِ عفوِ کریم　　کچھ نہ کام آئی پشیمانی مری
خلد میں بھی گر رہی یاد اُسکی زلف　　کم نہ ہو شاید پریشانی مری
ہے لباسِ جسم تک مجھ پر گراں　　دور جا پہنچی ہے عُریانی مری
مانِع گلگشت ہے بیمِ خزاں　　موت کرتی ہے نگہبانی مری
قدرِ نعمت ہے بقدرِ انتظار　　حشر پر ٹھہری ہے مہمانی مری
خندہ زن ہے اس مُسلمانی پہ کُفر
جیسی ہے **حالی** مُسلمانی مری

پردے بہت سے وصل میں بھی درمیاں رہے　　شکوے وہ سب سُنا کیے اور مہرباں رہے
کیا کیا ہیں دل میں دیکھیے ارماں بھرے ہوئے　　ہم میزباں نہیں جو کوئی میہماں رہے
حرماں میں ہاتھ سے نہ دیا رشتۂ اُمید　　اُب تک تو ہم جہاں میں بہت شادماں رہے
پوچھی گئی نہ بات کہیں پاسِ وضع کی　　اُتنے ہی ہم سُبک ہوئے جتنے گراں رہے

حالی سے مل کے ہو گئے تم افسردہ دل بہت -
اگلے سے ولولے وہ اب اُس میں کہاں رہے

کل مُدّعی کو آپ پہ کیا کیا گماں رہے بات اُسکی کاٹتے رہے اور ہمزباں رہے
یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا ہم محوِ نالۂ جرسِ کارواں رہے
یا کھینچ لائے دیر سے رندوں کو اہلِ وعظ یا آپ بھی ملازمِ پیرِ مغاں رہے
وصلِ مدام سے بھی ہماری بجھی نہ پیاس ڈوبے ہم آبِ خضر میں اور نیمجاں رہے
کل کی خبر غلط ہو تو جھوٹے کا رو سیاہ تم مدّعی کے گھر گئے اور میہماں رہے
حالی کے بعد کوئی نہ ہمدرد پھر ملا
کچھ راز تھے کہ دل میں ہمارے نہاں رہے

حق وفا کے جو ہم جتانے لگے آپ کچھ کہہ کے مُسکرانے لگے
تھا یہاں دل میں طعنِ وصلِ عدو عذر اُن کی زباں پہ آنے لگے
ہم کو جینا پڑے گا فرقت میں وہ اگر ہمّت آزمانے لگے
ڈر ہے میری زباں نہ کھل جائے اب وہ باتیں بہت بنانے لگے
جان بچتی نظر نہیں آتی غیر اُلفت بہت جتانے لگے
تم کو کرنا پڑے گا عذرِ جفا ہم اگر دردِ دل سنانے لگے
سخت مشکل ہے شیوۂ تسلیم ہم بھی آخر کو جی چرانے لگے
جی میں ہے لوں رضائے پیرِ مغاں قافلے پھر حرم کو جانے لگے
سرِ باطن کو فاش کر یا رب اہلِ ظاہر بہت ستانے لگے
وقتِ رخصت تھا سخت حالی پر ہم بھی بیٹھے تھے جب وہ جانے لگے

حشر تک یاں دل شکیبا چاہیے
کب ملیں دلبر سے دیکھا چاہیے ق
ہے تجلّی بھی نقابِ روئے یار
اُس کو کن آنکھوں سے دیکھا چاہیے
غیر ممکن ہے نہ ہو تاثیرِ غم
حالِ دل پھر اُس کو لکھا چاہیے
ہے دل افگاروں کی دلداری ضرور
گر نہیں اُلفت مدارا چاہیے
ہے کچھ اِک باقی خلش اُمّید کی
یہ بھی مٹ جائے تو پھر کیا چاہیے
دوستوں کی بھی نہ ہو پروا جسے
بے نیازی اُس کی دیکھا چاہیے
بھا گئے ہیں آپ کے انداز و ناز
کیجیے اغماض جتنا چاہیے
شیخ! ہے اُن کی نگہ جادو بھری
صحبتِ رنداں سے بچنا چاہیے
لگ گئی چُپ **حالیِ** رنجور کو
حال اس کا کس سے پوچھا چاہیے

جنوں کارفرما ہوا چاہتا ہے
قدم دشت پیما ہوا چاہتا ہے
دمِ گریہ کس کا تصوّر ہے دِل میں
کہ اشک دریا ہوا چاہتا ہے
خط آنے لگے شکوہ آمیز اُن کے
ملاپ اُن سے گویا ہوا چاہتا ہے
بہت کام لینے تھے جس دل سے ہمکو
وہ صرفِ تمنّا ہوا چاہتا ہے
ابھی لینے پائے نہیں دم جہاں میں
اَجل کا تقاضا ہوا چاہتا ہے
مجھے کل کے وعدے پہ کرتے ہیں رخصت
کوئی پورا وعدہ ہوا چاہتا ہے
فزوں تر ہے کچھ ان دِنوں ذوقِ عصیاں
دَرِ رحمت اَب وا ہوا چاہتا ہے
قلق گر یہی ہے تو رازِ نہانی
کوئی دن میں رُسوا ہوا چاہتا ہے
بہت چین سے دن گذرتے ہیں **حالی**
کوئی فتنہ برپا ہوا چاہتا ہے

ق جس کو غصے میں لگاوٹ کی ادا یاد رہے
آج دل لیگا اگر کل نہ لیا یاد رہے
شوق بڑھتا گیا جوں جوں رُکے اُس شوخ سے ہم
یہ سبق وہ ہے کہ بھولے سے سوا یاد رہے
ہم بھی آداب شریعت سے تھے آگاہ مگر
نہ ہو برتاؤ میں جو رسم وہ کیا یاد رہے
یاد آؤ گے بہت۔ لطف سمجھ کر یہ کہے
اس بھلائی کا ہے انجام برا یاد رہے
شیخ یاں شرم گنہ شوق بھلا دیتا ہے
توبہ انکی ہے جنھیں اپنی خطا یاد رہے
وادیٔ عشق میں موسیٰ کا ہو گر رخصتِ دید
ہاتھ کٹوائیں جو پھر کفش و عطا یاد رہے
خضر نے پانو اگر دشتِ فنا میں رکھا
بھول جائیں گے رہِ آبِ بقا یاد رہے
دل بُری طرح لگا عشقِ بتاں میں اے شیخ
دیں پڑا پائیں اگر اب کے خدا یاد رہے
چارہ گر! کار باندازۂ تدبیر نہیں
کیجیو ہمت اگر وقتِ دُعا یاد رہے

ابھی جانا نہیں **حالی** نے کہ کیا چیز ہیں وہ
حضرت اس لطف کا پائیں گے مزا یاد رہے

ملنے کی جو نہ کرنی تھی تدبیر کر چکے
آخر کو ہم حوالۂ تقدیر کر چکے
افسوں شبِ وصال کے واں کارگر نہیں
نالے شبِ فراق کے تاثیر کر چکے
ایدل اب آزمائش تقدیر کا ہے وقت
وہ امتحان بُرشِ شمشیر کر چکے
کہتے ہیں طبعِ دوست شکایت پسند ہے
ہم شکوہ ہائے غیر بھی تحریر کر چکے
بھولے رہے تصوّرِ مژگاں میں چند روز
دیکھا تو دل کو ہم ہدفِ تیر کر چکے
جاں لب تک انتظار میں آتی ہی بار بار
مشاطہ جلد تر کہیں تقریر کر چکے
دل لیکے ایک میرا یہ فارغ ہوئے ہیں وہ
گویا کہ اِک جہان کو تسخیر کر چکے
حالیؔ اب آؤ پیرویِ مغربی کریں
بس اقتدائے مصحفی و میر کر چکے

ق

نہ واں پرسش نہ یاں تابِ سخن ہے   محبّت ہے کہ دل میں موج زن ہے
بہت لگتا ہے دل صحبت میں اُس کی   وہ اپنی ذات سے اِک انجمن ہے
بناوٹ سے نہیں خالی کوئی بات   مگر ہر بات میں اِک سادہ پن ہے
عدو سے بات محفل میں نہ کرنی   جو سچ پوچھو تو جائے سوءِ ظن ہے
بہت دل ہیں ترے عاشق کو درکار   تری جو بات ہے وہ دل شکن ہے
دلاتی ہے صبا کس کو چمن یاد   نہ میں بُلبل نہ گھر میرا چمن ہے
کروں تجھ سے بیاں کچھ دردِ غربت   مگر جوشِ سخن مُہرِ دہن ہے
رہے لاہور[ف۱] میں آ کر سو جانے   یہی دنیا ہے جو دارالمحن ہے
نہیں آتی کہیں یاں بوئے یوسف   مگر جو گھر ہے وہ بیت الحزن ہے
نہ کچھ مجنوں کو ہے پروائے لیلیٰ   نہ کچھ شیریں کو دردِ کوہ کن ہے
مجھے تنہا نہ سمجھیں اہلِ لاہور   تصوّر میں مرے اِک انجمن ہے
مری خلوت میں ہے ہنگامۂ بزم   خموشی میں مری ذوقِ سخن ہے
بتاؤں تمکو ہوں کس باغ کا پھول؟   جہاں ہر گل بجائے خود چمن ہے
بتاؤں تمکو ہوں کس مصر کی بو؟   جہاں غربت وطن پر خندہ زن ہے

[ف۱] یہ غزل تقریباً ۱۲۸۹ھ میں جب کہ اوّل ہی اوّل بتقریب ملازمت دلّی چھوڑ کر لاہور جانا پڑا تھا اُس وقت اوّل تو دلّی سے جدا ہونا ہی سخت شاق گذر رہا تھا۔ دوسرے لاہور میں جان پہچان نہ تھی وہاں پہنچتے ہی نہایت سخت وبا آئی اور وبائے ہیضہ کے بعد مدت تک چیچک اور بخار کا زور شور رہا۔ آخرکار راقم بھی سخت بیمار ہو گیا۔ اس تنہائی اور سراسیمگی و غم و اندوہ کی حالت میں یہ اشعار لکھے گئے۔ ۱۲

عدم کی راہ کٹ جاتی کبھی کی   مگر یادِ عزیزاں راہزن ہے
نہ لینے دے گا جنت میں بھی آرام   یہی گر جذبۂ مہرِ وطن ہے
گریں نظروں سے سب باتیں پُرانی   مگر اُلفت کہ اِک رسمِ کہن ہے
بھلا حالیؔ اور اُلفت سے ہو خالی!   یہ سب تم صاحبوں کا حسنِ ظن ہے
کیا ہے اُس نے کہتے ہیں سخن ترک
مگر ہم کو ابھی اس میں سخن ہے

دھوم تھی اپنی پارسائی کی   کی بھی اور کس سے آشنائی کی
کیوں[1] بڑھاتے ہو اختلاط بہت   ہم کو طاقت نہیں جدائی کی
مُنہ کہاں تک چھپاؤ گے ہم سے   تم کو عادت ہے خود نمائی کی
لاگ میں ہیں لگاؤ کی باتیں   صلح میں چھیڑ ہے لڑائی کی
ملتے غیروں سے ہو ملو لیکن   ہم سے باتیں کرو صفائی کی
دل رہا پائے بندِ اُلفتِ دام   تھی عبث آرزو رہائی کی
دل بھی پہلو میں ہو تو یاں کس سے   رکھیئے اُمید دلربائی کی
شہر و دریا سے باغ و صحرا سے   بو نہیں آتی آشنائی کی
نہ ملا کوئی غارتِ ایماں   رہ گئی شرم پارسائی کی
بخت ہمداستانیِ شیدا[2]   تو نے آخر کو نارسائی کی

---

[1] یہ غزل بھی لاہور میں اس وقت لکھی گئی تھی جبکہ غزل سابق لکھی گئی تھی۔ آخر کے اشعار میں اس امر کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے۔ ۱۲

[2] شیدا سے مراد منشی محمد کرم اللہ خاں صاحب دہلوی ہیں کہ اس زمانہ میں کبھی کبھی فکر شعر کرتے تھے اور شیدا تخلص کرتے تھے۔ ۱۲

صحبتِ گاہ گاہیِ رشکیؔ[۱]   تو نے بھی ہم سے بے وفائی کی
موت کی طرح جس سے ڈرتے تھے   ساعت آپہنچی اِس جُدائی کی
زندہ پھرنے کی ہے ہوس حالیؔ
انتہا ہے یہ بے حیائی کی

ق
کر دیا خوگرِ جفا تو نے   خوب ڈالی تھی ابتدا تو نے
دور پہنچی تھی اپنی آزادی   پر خدا جانے کیا کیا تو نے
کیوں نہ آئینگے یاں وہ اے ہمدم   بس سُنا میں نے اور کہا تو نے
گوش و لب ساتھ لائے تھے ہم آج   نہ کہا اور نہ کچھ سُنا تو نے
صبر کا ہے بہت بُرا انجام   ہمکو سمجھا ہی دل میں کیا تو نے
ابتدائے وفا ہے سر دینا   میری دیکھی نہ انتہا تو نے
دل سے قاصد بنا کے وعدۂ وصل   اور کھویا رہا سہا تو نے
ایک عالم کو خوش کیا اے رشک   ہم کو کس سے خفا تو نے
جی میں کیا ہے جو بخشوایا آج
حالی اپنا کہا سُنا تو نے

ق
کرکے بیمار دی دوا تو نے   جان سے پہلے دل لیا تو نے
رہروِ تشنہ لب نہ گھبرانا   اب لیا چشمۂ بقا تو نے
شیخ جب دل ہی دیر میں نہ لگا   آکے مسجد سے کیا لیا تو نے
دور ہو اے دلِ مآل اندیش   کھو دیا عمر کا مزا تو نے

---

[۱] رشکی آنریبل نواب محمد علی خاں بہادر رئیس جہانگیر آباد کا تخلص ہے - ۱۲

ایک بیگانہ وار کر کے نگاہ   کیا کیا چشم آشنا تو نے
دل و دیں کھو کے آئے تھے سوئے دیر   یاں بھی سب کچھ دیا خدا تو نے

خوش ہے اُمید خُلد پر **حالی**
کوئی پوچھے کہ کیا کیا تو نے

ق دل کو درد آشنا کیا تو نے   درد دل کو دوا کیا تو نے
طبع انساں کو سرشتِ وفا   خاک کو کیمیا کیا تو نے
وصلِ جاناں محال ٹھہرایا   قتلِ عاشق روا کیا تو نے
تھا نہ جز غم بساطِ عاشق میں   غم کو راحت فزا کیا تو نے
جان تھی اِک وبال فرقت میں   شوق کو جاں گزا کیا تو نے
تھی محبت میں ننگ منتِ غیر قطعہ   جذبِ دل کو رسا کیا تو نے
راہ زاہد کو جب کہیں نہ ملی   درِ مے خانہ وا کیا تو نے
قطع ہونے ہی جب لگا پیوند   غیر کو آشنا کیا تو نے
تھی جہاں کارواں کو دینی راہ   عشق کو رہنما کیا تو نے
ناؤ بھر کر جہاں ڈبونی تھی   عقل کو ناخدا کیا تو نے
بڑھ گئی جب پدر[1] کو مہرِ پسر   اس کو اُس سے جُدا کیا تو نے
جب ہوا مُلک و مال رہزنِ ہوش   بادشہ کو گدا کیا تو نے
جب ملی کام جاں کو لذتِ درد   درد کو بے دوا کیا تو نے

---

[1] اس شعر میں پدر و پسر کا اشارہ حضرت یعقوب و یوسف علیہ السلام کی طرف اور اگلے شعر میں بادشاہ سے مراد ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ ہیں۔ ۱۲

جب دیا راہ رو کو ذوقِ طلب   سعی کو نارسا کیا تو نے
پردۂ چشم تھے حجاب. بہت   حسن کو خود نما کیا تو نے
عشق کو تاب اِنتظار نہ تھی   غرفہ ایک دل میں وا کیا تو نے
حرم آباد اور دیر خراب   جو کیا سب. بجا کیا تو نے
سخت افسردہ طبع تھے احباب   ہم کو جادو نوا کیا تو نے
پھر جو دیکھا تو کچھ نہ تھا یارب   کون پوچھے کہ کیا کیا تو نے

حالیؔ اٹھا ہلا کے محفل کو
آخر اپنا کہا کیا تو نے

رُباعیّات

توحید

کانٹا ہے ہر اِک جگر میں اٹکا تیرا
حلقہ ہے ہر اِک گوش میں لٹکا تیرا
مانا نہیں جس نے تجکو۔ جانا ہے ضرور
بھٹکے ہوئے دل میں بھی ہے کھٹکا تیرا

ایضاً

ہندو نے صنم میں جلوہ پایا تیرا
آتش پہ مغاں نے راگ گایا تیرا
دہری نے کیا دہر سے تعبیر تجھے
انکار کسی سے بَن نہ آیا تیرا

ایضاً

طوفاں میں ہے جب جہاز چکّر کھاتا
جب قافلہ وادی میں ہے سر ٹکراتا
اسباب کا آسرا ہے جب اُٹھ جاتا
واں تیرے سوا کوئی نہیں یاد آتا

ایضاً

جب لیتے ہیں گھیر تیری قدرت کے ظہور
مُنکر بھی پکار اُٹھتے ہیں تجکو مجبور
خفّاش کو ظلمت کی نہ سوجھی کوئی راہ
خورشید کا نقش جہت میں پھیلا جب نور

توحید

جب مایوسی دلوں پہ چھا جاتی ہے   دشمن سے بھی نام تیرا جپواتی ہے
ممکن ہے کہ سُکھ میں بھول جائیں اطفال   لیکن اُنھیں دُکھ میں ماں ہی یاد آتی ہے

ایضاً

مٹی سے۔ ہوا سے آتش و آب سے یاں   کیا کیا نہ ہوئے بشر پہ اسرار عیاں
پر۔ تیرے خزانے ہیں ازل سے اب تک   گنجینۂ غیب میں اسی طرح[1] نہاں

ایضاً

ہستی سے ہے تیری رنگ و بو سب کے لیے   طاعت میں ہی تیری۔ آبرو سب کے لیے
ہیں تیرے سوا سارے سہارے کمزور   سب اپنے لیے ہیں اور تو سب کے لیے

ایضاً

کیا ہوگی دلیل تجھ پہ اور اس سے زیاد   دنیا میں نہیں ہے ایک دل جو کہ ہو شاد
پر۔ جو کہ ہیں تجھ سے لو لگائے بیٹھے   رہتے ہیں ہر ایک رنج و غم سے آزاد

نعت

زُہاد کو تو نے محوِ تمجید کیا   عشاق کو مستِ لذتِ دید کیا
طاعت میں رہا نہ حق کا ساجھی کوئی   توحید کو تو نے آ کے توحید کیا

ایضاً

بطحائے عرب کو محترم تو نے کیا   اور اُمیّوں کو خیرِ اُمم تو نے کیا
اسلام سنے ایک کر دیا روم و تتار   بچھڑے ہوئے گلّہ کو بہم تو نے کیا

---

[1] یعنی جو کچھ اب تک ظاہر ہوا ہے وہ بمقابلہ اس کے جو خزانہ غیب میں مخفی ہے کان لم یکن ہے۔ ۱۲

نعت

بطحا کو ہوا تیری ولادت سے شرف
یثرب کو ملا تیری اقامت سے شرف
اولاد ہی کو فخر نہیں کچھ تجھ پر
آبا کو بھی ہے تیری ابوت سے شرف

صلح کل

ہندو سے لڑیں نہ گبر سے بیر کریں
شر سے بچیں اور شر کے عوض خیر کریں
جو کہتے ہیں یہ کہ ہے جہنم دنیا
وہ آئیں اور اس بہشت کی سیر کریں

ترک شعر عاشقانہ

بلبل کی چمن میں ہم زبانی چھوڑی
بزم شعرا میں شعر خوانی چھوڑی
جب سے دل زندہ تو نے ہم کو چھوڑا
ہم نے بھی تری رام کہانی چھوڑی

پیرانِ زندہ دل

خوش رہتے ہیں دکھ میں کامرانوں کی طرح
ہیں ضعف سے لڑتے پہلوانوں کی طرح
دل- اُن کے ہیں- ظرف اُنکے- جو کرتے ہیں تیر
ہنس بول کے پیری کو جوانوں کی طرح

نیکی اور بدی پاس پاس ہیں

جو لوگ ہیں نیکیوں میں مشہور بہت
ہوں نیکیوں پر اپنی نہ مغرور بہت
نیکی ہی خود ایک بدی ہے گر ہو نہ خلوص
نیکی سے بدی نہیں ہے کچھ دور بہت

امتحان کا وقت

زاہد کہتا تھا جان ہے دیں پر قربان پر آیا جب امتحاں کی زد پر ایمان
کی عرض کسی نے کہیے اب کیا ہے صلاح فرمایا کہ "بھائی جان جی ہے تو جہان"

عشق

ہے عشق طبیب دل کے بیماروں کا یا گھر ہے وہ خود ہزار آزاروں کا
ہم کچھ نہیں جانتے۔ یہ اتنی ہے خبر اِک مشغلہ دلچسپ ہے بیکاروں کا

نیکوں کی جانچ

نیکوں کو نہ ٹھہرائیو بد اے فرزند ایک آدھ ادا اُن کی اگر ہو نہ پسند
کچھ نقص انار کی لطافت میں نہیں ہوں اُس میں اگر گلے سڑے دانے چند

دوستوں سے بیجا توقع

تا زیست وہ محوِ نقشِ موہوم رہے جو طالب دوستانِ معصوم رہے
اصحاب سے بات بات پر جو بگڑے صحبت کی وہ برکتوں سے محروم رہے

شراب اور جوانی

ہو بادہ کشی پر نہ جوانو! مفتوں گردن پہ نہ لو عقلِ خدا داد کا خوں

خود عہد شباب اک جنوں ہے اب تم — کرتے ہو فزوں جنوں پہ اک اور جنوں

غرور سب عیبوں سے بدتر ہے

ممکن نہیں یہ کہ ہو بشر عیب سے دور — پر عیب سے بچیے تا بمقدور ضرور
عیب اپنے گھٹاؤ پر خبردار رہو — گھٹنے سے کہیں انکے نہ بڑھ جائے غرور

گفتار و کردار میں اختلاف

جو کرتے ہیں کچھ زباں سے کہتے ہیں وہ کم — ہوتے نہیں ساتھ جمع دم اور قدم
بڑھتا گیا جس قدر کہ حسن گفتار — بس اتنے ہی گھٹتے گئے کردار میں ہم

شرطِ قبول

ممکن ہے کہ جوہر کی نہ ہو قدر کہیں — پر قدر کہیں بغیر جوہر کے نہیں
عنبر کو نہ لیں مفت یہ امکاں ہے مگر — عنبر کی جگہ نہ لے گا کوئی سرگیں

طالب کو سوچ سمجھکر پیر بنانا چاہیے

ہوں یا نہ ہوں پیر اہلِ عرفاں یقیں — پر ڈر ہے کہ طالب نہ ہوں ناداں کہیں
گاہک کو ہے احتیاج چار آنکھوں کی — اور ایک کی بھی بیچنے والے کو نہیں

عالم و جاہل میں کیا فرق ہے

ہیں جہل میں سب عالم و جاہل ہمسر — آتا نہیں فرق اس کے سوا ان میں نظر

عالم کو ہے علم اپنی نادانی کا جاہل کو نہیں جہل کی کچھ اپنے خبر

موجودہ ترقی کا انجام

پوچھا جو کل انجام ترقئ بشر یاروں سے کہا پیرِ مغاں نے ہنس کر
باقی نہ رہے گا کوئی انساں میں عیب ہو جائیں گے چھل، چھلا کے سب عیب ہنر

مسرف کو کیوں کر فراغت حاصل ہو سکتی ہے

ایک منعم مسرف نے یہ عابد سے کہا کر میرے لیے حق سے فراغت کی دعا
عابد نے کہا یہ ہاتھ اٹھا کر سوئے چرخ محتاج کر اس کو جلد اے بارِ خدا

کام کی جلدی

یاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے آتا ہے اگر آج۔ تو کل جاتا ہے
جو کرنے کے ہیں کام اُن کو جلدی بھگتا دو طلبی کا پیام دو چلا آتا ہے

غرض

ہے نفس میں انساں کے جبلّی یہ مرض ہر سعی پہ ہوتا ہے طلبگارِ عوض
جو خاص خدا کے لیے کتنے کام کیے دیکھا تو نہاں ان میں بھی تھی کوئی غرض

انقلابِ روزگار

بس بس کے ہزاروں گھر اُجڑ جاتے ہیں گر گر کے عَلَم لاکھوں اُکھڑ جاتے ہیں

آج اُنکی ہے نوبت تو کل اُس کی باری
بن بن کے یونہیں کھیل بگڑ جاتے ہیں

تقاضائے سِن

حالی کو جو کل فسردہ خاطر پایا
پوچھا باعث تو ہنس کے یہ فرمایا
رکھو نہ اب اگلی صحبتوں کی اُمید
وہ وقت گئے اب اور موسم آیا

جس کو زندگانی کا بھروسا نہیں وہ کوئی بڑا کام نہیں کرسکتا

دنیائے دنی کو نقشِ فانی سمجھو
روداد جہاں کو اک کہانی سمجھو
پر جب کرو آغاز کوئی کام بڑا
ہر سانس کو عمرِ جاودانی سمجھو

ہر چیز یہاں کی آنی جانی سمجھو

آثارِ زوال

آبا کو زمین و ملک پر اطمینان
اولاد کو مستی پہ قناعت کا گمان
بیٹے آوارہ اور بیٹے کو [illegible] جوان
ہیں ایسے گھرانے کوئی دن کے مہمان

شانِ ادبار

صحرا میں جو پایا ایک چٹیل میدان
برسات میں سبزہ کا نہ تھا جس پہ نشان
مایوس تھے جس سے جوتنے سے دہقان
یاد آتی ہیں قوم کے ادبار کی شان

نفاق کی علامت

ہر بزم میں آفریں کے لائق ہونا
شیریں سخنی سے شہد فائق ہونا

ممکن نہیں جبتک کہ نہ ہو دلمیں نفاق   آساں نہیں مقبولِ خلائق ہونا

مُسلمانوں کی بے مِہری

جب تک کہ نہ ہو دشمنِ اخوان پکّا   ہوتا نہیں مومن کا اب ایمان پکّا
ہم قوم کی خیر مانگتے ہیں حق سے   سُنتے ہیں کسی کو جب مسلماں پکّا

مکر و ریا

حالی رَہِ راست جو کہ چلتے ہیں سدا   خطرہ انھیں گرگ کا نہ ڈر شیروں کا
لیکن اُن بھیڑیوں سے واجب ہی حذر   بھیڑوں کے لباس میں ہیں جو جلوہ نما

جوہرِ قابلیت

ہیں بے ہنروں میں قابلیت کے نشاں   پوشیدہ ہیں وحشیوں میں اکثر انساں
عاری ہیں لباسِ تربیت سے ورنہ   ہیں طوسی و رازی انھیں شکلوں میں نہاں

علم

اے علم کیا ہے تو نے ملکوں کو نہال   غائب ہوا تو جہاں سے واں آیا زوال
اُن پر ہوئے غیب کے خزانے مفتوح   جن قوموں نے ٹھیرایا تجھے راس المال

ایضاً

اے علم کلیدِ گنجِ شادی تو ہے   سرچشمۂ نعما و آبادی تو ہے

آسائشِ دو جہاں ہے سایہ میں ترے
دنیا کا وسیلہ دین کا ہادی تو ہے

علم

ہے تجھ سے نہال جیسی مغرب کی زمیں
مشرق کو وہ فیض تجھ سے اے علم نہیں
شاید اے علم ماہِ نخشب کی طرح
رہتی ہیں شعاعیں تری محدود وہیں

خاندانی عزّت

بیٹا نکلے نہ جب تلک ذلّت سے
عزّت نہیں اُس کو باپ کی عزّت سے
سوچو تو ہے گھات کا نسب بھی عالی
پر اُس کو شرف نہیں کچھ اِس نسبت سے

عزّت کس چیز میں ہے

دولت نے کہا مجھ سے ہی عزّت ہے جہاں
فرمایا ہنر نے میں ہوں عزّت کا نشاں
عزّت بولی غلط ہے دونوں کا بیاں
میں بھید ہوں حق کا جو ہے نیکی میں نہاں

توقّع بیجا

ہیں یار رفیق پر مصیبت میں نہیں
ساتھی ہیں عزیز۔ لیک ذلّت میں نہیں
اُس بات کی انسان سے توقع ہے عبث
جو نوعِ بشر کی خود جبلّت میں نہیں

عقل اور دوستی متضاد ہیں

ہے عقل میں جس قدر کمی اور بیشی
اِتنی ہی مغائرت ہے یاں اور خویشی

وہ دوست نہیں جس نے کیا فکرِ مآل   ضدین ہیں دوستی و دور اندیشی

عیش و عشرت

عشرت کا ثمر تلخ سدا ہوتا ہے   ہر قہقہہ پیغامِ بُکا ہوتا ہے
جس قوم کو عیش دوست پاتا ہوں میں   کہتا ہوں میں اب دیکھیے کیا ہوتا ہے

ایضاً

اے عیش و طرب تو نے جہاں راج کیا   سلطاں کو گدا غنی کو محتاج کیا
ویران کیا تو نے نینوا اور بابل   بغداد کو قرطبہ کو تاراج کیا

غیبت

رونق ہی ہر اک بزم کی اب غیبت میں   بد گوئی خلق ہے ہر اک صحبت میں
اوروں کی بُرائی ہی پہ ہے فخر وہاں   خوبی کوئی باقی نہیں جس اُمت میں

عشق

اے عشق کیا تو نے گھرانوں کو تباہ   پیروں کو خرف اور جوانوں کو تباہ
دیکھا ہے سدا سلامتی میں تیری   قوموں کو ذلیل خاندانوں کو تباہ

سبب زوالِ سلطنت

دیکھو جس سلطنت کی حالت درہم   سمجھو کہ وہاں ہے کوئی برکت کا قدم
یا تو کوئی بیگم ہے مشیرِ دولت   یا ہے کوئی مولوی وزیرِ اعظم

دین و دُنیا کا رشتہ

دُنیا کو دیے دین نے اسرار و حِکَم		دنیا نے مگر دین کی تھامی جس دَم
گر دین کی ممنون بہت ہے دُنیا		دنیا کے بھی احسان نہیں دین پہ کم

آزادگانِ راستباز کی تکفیر

یاروں میں نہ پایا جب کوئی عیبِ گناہ		کافر کہا واعظ نے اُنھیں اور گمراہ
جھوٹے[لہ] کو نہیں ملتی شہادت جس وقت		لاتا ہے خدا کو اپنے دعوے پہ گواہ

بے پروائی و بے غیرتی

اسباب پہ گر نظمِ جہاں کا ہے مدار		اس قوم کا جیتنا ہے حالیؔ دشوار
عزّت کی نہیں ہے جس کو ہرگز پروا		ذلّت سے نہیں ہے جس کو ہرگز کچھ عار

عفو باوجود قدرتِ انتقام

موسیٰ نے یہ کی عرض کہ اے یارِ خدا		مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا

[لہ] یعنی کفر و ضلالت ایسی چیزیں ہیں جن کا علم خدا کے سوا اور کسی کو نہیں ہو سکتا۔ مثلاً شیخ اکبر کو بعضوں نے صدیق کہا ہے اور بعضوں نے زندیق۔ اور یہ بات کہ وہ فی الواقع صدیق تھے یا زندیق خدا کے سوا اور کوئی نہیں جانتا پس جس شخص میں کوئی صریح اخلاقی بُرائی یا عیب موجود نہ ہو اسکی تکفیر یا تضلیل کرنی ایسی بات ہے جیسے کسی جھوٹے مدّعی کو شہادت نہ ملے اور اپنے دعوے پر خدا کو گواہ قرار دے۔ ۱۲

ارشاد ہوا بندہ ہمارا وہ ہے   جو لڑ سکے اور نہ لے بدی کا بدلہ

سختی کا جواب نرمی ہے

فتنے کو جہاں تلک ہو دیجے تسکیں   زہر اُگلے کوئی تو کیجیے باتیں شیریں
غصہ غصے کو اور بھڑکاتا ہے   اس عارضہ کا علاج بالمثل نہیں

کم ہمتی

جبریہ و قدریہ کی بحث و تکرار   دیکھا تو نہ تھا کچھ اس کا مذہب پہ مدار
جو کم ہمت تھے ہو گئے وہ مجبور   جو باہمت تھے بن گئے وہ مختار

پشیمانی

انجام ہے جو کفر کی طغیانی کا   ثمرہ ہے وہی غفلت و نادانی کا
لذت سے نداموں کی جانا ہمنے   دوزخ بھی ہے اک نام پشیمانی کا

تاسف بر وفات نواب ضیاء الدین احمد خاں مرحوم نیر تخلص دہلوی

قمری ہے نہ طاؤس نہ کبکِ طنّاز   آتے ہی خزاں کے کر گئے سب پرواز
تھی باغ کی یادگار اک بلبل زار   سو اُس کی بھی گل سے نہیں آتی آواز

ایضاً

غالبؔ ہے نہ شیفتہ نہ نیر باقی   وحشت ہے نہ سالک ہے نہ انور باقی[1]

---

[1] یہ اُن شعراے دہلی کے نام ہیں جنکے ساتھ راقم کو ربط اور اختصاص رہا ہے عام اس سے کہ وہ مشہور و نامور ہوں یا ہون

حالی اب اِسی کو بزمِ یاراں سمجھو   یاروں کے جو کچھ داغ ہیں دل پر باقی

محنت

محنت ہی کے پھل ہیں یاں ہر اِک امن میں   محنت ہی کی برکتیں ہیں ہر خرمن میں
موسیٰ کو ملی نہ قوم کی چوپانی +   جب تک نہ چرائیں بکریاں مدین میں

گدائی کی ترغیب

اِک مردِ توانا کو جو سائل پایا   کی میں نے ملامت وہ بہت شرمایا
بولا کہ ہے اس کا اُنگلی گردن پہ وبال   دے دے کے جنھوں نے مانگنا سکھلایا

تکفیرِ اہلِ اسلام

کہنا فقہا کا مومنوں کو بے دیں   سنتے سنتے یہ ہو گیا ہم کو یقیں
مومن سے ضرور ہوگا مرقد میں سوال   تکفیر بھی کی تھی فقہا نے کہ نہیں؟

ترکِ عاشقانہ گوئی

کچھ قوم کی ہم سے سوگواری سُن لو   کچھ چشمِ جہاں میں اپنی خواری سُن لو
افسانۂ قیس و کوہکن یاد نہیں   چاہو تو کتھا ہم سے ہماری سُن لو

تنزلِ اہلِ اسلام

پستی کا کوئی حد سے گذرنا دیکھے   اِسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے

مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے

اوّل کوشش اور بعد دُعا

کوشش میں ہے شرط ابتدا انساں سے
پھر چاہیئے مانگنی مدد یزداں سے
جب تک کہ نہ کام دستِ بازو سے لیا[1]
پائی نہ نجات نوحؑ نے طوفاں سے

کام کرنا جان کے ساتھ ہے

ہے جان کے ساتھ کام انسان کے لیے
بنتی نہیں زندگی میں بے کام کیے
جیتے ہو تو کچھ کیجیے زندوں کی طرح
مُردوں کی طرح جیے تو کیا خاک جیے

جھوٹی نمائش

ہیں جھوٹ کے سچ میں سب نمونے والے
بننے والوں سے کم ہیں ہونے والے
گھڑیاں رہتی ہیں جن کی جیبوں میں مدام
اکثر ہیں وہی وقت کے کھونے والے

چند عیب بہت سی خوبیوں کو نہیں مٹا سکتے

موجود ہنر ہوں ذات میں جس کی ہزار
بدظن نہ ہو عیب اس میں اگر ہوں دو چار
طاؤس کے پائے زشت پر کرکے نظر
کر حسن و جمال کا نہ اُس کے انکار

---

[1] یعنی جب تک کہ کشتی نہ بنائی ۱۲

سکوتِ درویش جاہل

مصروف جو یوں وظیفہ خوانی میں ہیں آپ   خیر اپنی سمجھتے بے زبانی میں ہیں آپ
بولیں کچھ منہ سے یا نہ بولیں حضرت   معلوم ہے ہمکو جتنے پانی میں ہیں آپ

ملحدوں کا طعن مسلمانوں پر

کہتا تھا کل اِک منکر قرآن و خبر   کیا لیں گے یہ اہلِ قبلہ باہم لڑکر
کچھ دم ہو تو میدان میں آئیں ورنہ   کتا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر

دہری کا الزام گور پرست پر

اِک گور پرست نے یہ دہری سے کہا   ہوگا نہ شقی کوئی جہاں میں تجھ سا
دہری نے کہا کہ کیا خدا کا منکر   اُس سے بھی گیا کہ جس کے لاکھوں ہوں خدا

دانا کا حال نادانوں میں

کیا فرق؟ سماعت ہو جب کانوں میں   دانائی کی باتوں میں اور افسانوں میں
غربت میں ہے اجنبی مسافر جس طرح   دانا کا یہی حال ہے نادانوں میں

رفارم کی حد

دھونے کی ہے اے رفارمر جا باقی   کپڑے پہ ہے جب تلک کہ دھبّا باقی

دھو شوق سے دھبّے کو پہ اتنا نہ رگڑ   دھبّا رہے کپڑے پہ نہ کپڑا باقی

اپنی تعریف سُن کر ناک چڑھانا

تعریف سے کھل جاتے ہیں ناداں فی الفور   داناؤں کے لیکن نہیں ہرگز یہ طور
ہوتے ہیں بہت وہ مدح سُن کر ناخوش   مقصود یہ ہے کہ ہو ستائش کچھ اور

حُسنِ ظن اصل حال نہیں کھُلنے دیتا

صوفی کو کسی نے آزمایا ہی نہیں   نیکی میں شک اُس کی کوئی لایا ہی نہیں
ہو سکّہ رائج میں بھی شاید کچھ کھوٹ   پر اُس کو کسی نے یاں تپایا ہی نہیں

دینداروں کی بُرائیاں دین کو عیب لگاتی ہیں

پاتے ہیں زبوں جو حال اہلِ اسلام   اسلام پہ طعنہ زن ہیں اقوام تمام
بد پرہیزی سے بگڑے اپنی بیمار   اور مفت میں ہو گیا مسیحا بدنام

فکرِ عقبےٰ

منزل ہے بعید۔ باندھ لو زادِ سفر   موّاج ہے بحر۔ رکھو کشتی کی خبر
گاہک چوکس ہے۔ لیجیو مال کھرا   ہلکا کرو بوجھ ہے کٹھن راہگذر

انسان کی حقیقت

ممکن ہے کہ ہو جائے فرشتہ انساں   ممکن ہے۔ بدی کا نہ رہے اسم نشاں

ممکن تو ہے سب کچھ پہ حقیقت یہ ہے   انساں ہے اب تک وہی قرن الشیطان

سلاطین کا عشق

ہر چند بُرا ہے عشق کا سب کے مآل   پر حق میں ہے شاہوں کے خصوصاً بدفال
سلطاں ہے اگر ظلِ الٰہی تو عشق   ہے ظلِ الٰہی کے لیے وقت زوال

وقت کی مساعدت

اے وقت بگاڑ کا ہے سب کے چارہ   پر مجھ سے بگڑنے کا نہیں ہے یارا
ہو جائے گر ایک تو ہمارا ساتھی   پھر غم نہیں پھر جائے زمانہ سارا

بڑھاپے میں موت کے لیے تیار رہنا چاہیے

کی طاعتِ نفس میں بہت عمر بسر   انجام کی رکھی نہ جوانی میں خبر
کیفیت شب اٹھا چکے اب حالی   مجلس کرو برخاست ہوا وقتِ سحر

دولت میں ثابت قدم رہنا بہت مشکل ہے

ڈر ہے کہ پڑے نہ ہاتھ دل سے دھونا   زر دار ذرا سوچ سمجھ کر ہونا
جس طرح کہ سونے کی کسوٹی ہے محک   ہے جوہر انساں کی کسوٹی سونا

حد سے زیادہ غصہ قابلِ عفو ہے

غصہ پہ کسی کے غصہ آتا ہے وہیں   جب تک کہ ہے وہ عقل و دانش کے قریں

آپے سے جب اپنے ہو گیا تو باہر پھر کس سے ہوں آزردہ کہ تو تو ہی نہیں

سفہا کی مدح و ذم

کرتے ہیں سفیہ[1] اگر مذمت تیری کر شکر کہ ثابت ہوئی عصمت تیری
پر مدح کریں وہ گر (نصیبِ اعدا) رکھ یاد کہ اچھی نہیں حالت تیری

مرضِ پیری لا علاج ہے

اب ضعف کے پنجہ سے نکلنا معلوم پیری کا جوانی سے بدلنا معلوم
کھوئی ہے وہ چیز جس کا پانا ہی محال آتا ہے وہ وقت جس کا ٹلنا معلوم

اسراف

مُسرف نہ بس اپنے حق میں کانٹے بوئیں نعمت نہ خدا کی رائیگاں یوں کھوئیں
گر بخل پہ لوگ اُن کے ہنسیں بہتر ہے اس سے کہ فضولیوں پہ اُن کی روئیں

ردِّ سوال

یہ سچ ہے کہ مانگنا خطا ہے۔ نہ صواب زیبا نہیں سائل پہ مگر قہر و عتاب
بدتر ہے ہزار بار اے دوں ہمت سائل کے سوال سے ترا تلخ جواب

---

[1] بے عقل، کمینہ۔ ۱۲

کھانا بغیر بھوک کے مزا نہیں دیتا

کھانے تو بہت میسر آئے ہیں ہمیں
جو دیکھ کے چکھ کے۔ دل سے بھائے ہیں ہمیں
پر سب سے لذیذ تھے وہ کھانے اے بھوک
جو تو نے کبھی کبھی کھلائے ہیں ہمیں

علم و عمل کا سرمایہ مال و دولت سے بہتر ہے

چھوڑو کہیں جلد مال و دولت کا خیال
مہمان کوئی دن کے ہیں دولت ہو کہ مال
سرمایہ کرو وہ جمع جس کو نہ کبھی
اندیشۂ فوت ہو نہ ہو خوفِ زوال

اچھوں کو بُرا سننے میں بھی مزا آتا ہے

رکھتے نہیں وہ مدح و ثنا کی پروا
جو کرکے بھلا۔ خلق سے سُنتے ہیں بُرا
ان گالیوں کا ہے جن کو چسکا حالی
آتا نہیں اُن کو کچھ دعاؤں میں مزا

[1] شکریۂ مدحِ کلامِ راقم

جوشِ خُمِ بادہ جامِ خالی میں ہوا
پھر ولولہ پیدا دلِ حالی میں ہوا
تسلیم نے دی کچھ اِس طرح دادِ سخن
مجھکو بھی شک اپنی بے کمالی میں ہوا

---

[1] مولوی سلیم الدین مرحوم نارنولی مقیم سجے پور متخلص بہ تسلیم نے چند قطعے اُردو اور فارسی کے راقم کے کلام کی ستائش میں اُس وقت بھیجے تھے جبکہ مدت سے فکر شعر کا اتفاق نہیں ہوا تھا ان قطعوں کے جواب میں یہ رباعی لکھی گئی تھی۔

احسانِ بے منّت

احسان کے ہے گر صلہ کی خواہش تم کو   تو اُس سے یہ بہتر ہے کہ احسان نہ کرو
کرتے ہو گر احسان تو کر دو اُسے عام   اتنا کہ جہاں میں کوئی ممنون نہ ہو

قانون بداخلاقی سے مانع نہیں ہوتے

قانون ہیں بیشتر یقیناً بے کار   حاشا کہ ہو اُن پہ نظمِ عالم کا مدار
جو نیک ہیں اُن کو نہیں حاجت اُنکی   اور بد نہیں بنتے نیک اُنسے زنہار

مخالفت کا جواب خاموشی سے بہتر نہیں

حق بول کے اہلِ شر سے اڑنا نہ کہیں   بھڑکے گی مُدافعت سے اور آتشِ کیں
گر چاہتے ہو کہ چُپ رہیں اہلِ خلاف   جز ترکِ خلاف کوئی تدبیر نہیں

ٹیکس

واعظ نے کہا کہ وقت سب جاتے ہیں ٹل   اک وقت سے اپنے نہیں ٹلتی تو اجل
کی عرض یہ ایک سیٹھ نے اُٹھ کر کہ حضور   ہے ٹیکس کا وقت بھی اسی طرح اٹل

انسان اپنے عیب اپنے سے بھی چھپاتا ہے

جیسا نظر آتا ہوں نہ ایسا ہوں میں   اور جیسا سمجھتا ہوں نہ ویسا ہوں میں

اپنے سے بھی عیب ہوں چھپاتا اپنے
بس مجکو ہی معلوم ہے جیسا ہوں میں

بڑھاپے میں عاشقی کا دم بھرنا

آہیں پیری میں شیخ! بھرتے نہیں یوں
دل دیتے ہیں پر جی سے گذرتے نہیں یوں
تھے تم تو ہر اک قید سے آزاد سدا
جو جیتے ہیں اس طرح وہ مرتے نہیں یوں

واعظوں کی سخت کلامی

اک گبر نے پوچھے جو اصولِ اسلام
واعظ نے درشتی سے کیا اُس سے کلام
بولا کہ حضور مقتدا ہوں جس کے
ایسی ملت اور ایسے مذہب کو سلام

نواب وقار الامرا اقبال الدولہ بہادر کی شان میں

توفیق[1] نے اُس کی چھوڑ دی ہمراہی
اقبال پہ جس نے فتحیابی چاہی
حالی سے جائے کون بازی اُن سے
ہے جن کی رگوں میں خونِ آصف جاہی

---

[1] یہ رُباعی سنہ ۱۳۰۹ھ میں جب کہ راقم حیدرآباد میں مقیم تھا اور نواب وقار الملک بہادر بمبئی سے پولو میں بازی جیت کر آئے تھے لکھی تھی مگر اُن کی خدمت میں بھیجی نہیں گئی۔ خونِ آصف جاہی کے لفظ میں اِس بات کا اشارہ ہے کہ وہ حضور سے قرابتِ قریبہ رکھتے ہیں اور اقبال کے لفظ میں اُن کے خطاب کی طرف اشارہ ہے۔ ۱۲

رُباعیاتِ قدیم

ہو عیب کی خو یا کہ ہنر کی عادت
مشکل سے بدلتی ہے بشر کی عادت
چھٹتے ہی چھٹے گا اُس گلی میں جانا
عادت اور وہ بھی عمر بھر کی عادت

مرنے پہ مرے وہ روز و شب روئیں گے
جب یاد کریں گے مجھے تب روئیں گے
اُلفت پہ - وفا پہ - جاں نثاری پہ مری
آگے نہیں روئے تھے تو اب روئیں گے

فرقت میں بشر کی رات کیوں کر گذرے
اِک خستہ جگر کی رات کیوں کر گذرے
گذری نہ ہو جس بغیر یاں ایک گھڑی
یہ چار پہر کی رات کیوں کر گذرے

یاد اُس کی یہاں وردِ مدام اپنا ہے
خالی نہ ہو جو کبھی وہ جام اپنا ہے
کس طرح نہ لیجیے کہ ہے نام اُس کا
کس طرح نہ کیجیے کہ کام اپنا ہے

کیا پاس تھا قولِ حق کا اللہ اللہ
تنہا تھے پہ اعدا سے یہ فرماتے تھے شاہ
میں اور اطاعتِ یزیدِ گمراہ!!
لاحول ولا قوۃ الا باللہ

حُرؔ کہتا تھا اے دل شہِ ذی جاہ سے مل
گمرہ نہ ہو رہبرِ حق آگاہ سے مل
سرگشتگی کوئے ضلالت کب تک؟
اللہ سے ملنا ہے تو چل شاہ سے مل

گر کفر میں فرعون کا ثانی نکلا
اِک شام میں بیداد کا بانی نکلا
سمجھا تھا نہ تھاہ بحرِ غفلت کی یزید
وہاں نیل سے بھی زیادہ پانی نکلا

قصیدے، ترکیب بند، مسدس اور چند قطعے

مختلف مضامین پر

(بہ ترتیبِ اوقاتِ تحریر)

قصیدۂ نعتیہ[1]

بنے ہیں مدحتِ سلطانِ دو جہاں کیلیے　　سخن زباں کے لیئے اور زباں دہاں کیلیے
وہ شاہ جس کا عدو جیتے جی جہنم میں　　عداوت اُس کی عذابِ الیم جاں کیلیے
وہ شاہ جس کا محب امن و عافیت میں مدام　　محبت اُس کی حصارِ حصیں، اماں کیلیے
وہ چاند جس سے ہوئی ظلمتِ جہاں معدوم　　رہا نہ تفرقۂ روز و شب زماں کیلیے
وہ پھول جس سے ہوئی سعیِ باغباں مشکور　　رہی نہ آمد و رفتِ چمن خزاں کیلیے
ہلال مکہ کا۔ ماہِ دو ہفتہ یثرب کا　　فروغ قوم کے اور شمع دودماں کیلیے
گھر اُس کا موردِ قرآن و مہبطِ جبریل　　در اُس کا کعبۂ مقصودِ انس و جاں کیلیے

---

[1] یہ قصیدہ ۱۲۸۱ھ یا ۱۲۸۴ھ کا لکھا ہوا ہے۔ اس سے پہلے نعت میں کبھی کچھ نہیں لکھا گیا۔ اس کو اپنی قدیم شاعری کا نمونہ سمجھ کر بدستورِ سابق رہنے دیا ہے کہیں کچھ تصرف نہیں کیا گیا۔

سپہرِ گرمِ طواف اُس کی بارگاہ کے گرد
زمین سر بسجود اُس کے آستاں کے لیے
وہ لحظہ لحظہ تفقد وہ دم بدم الطاف
رضائے خاطرِ یارانِ جانفشاں کے لیے
وہ گونہ گونہ مدارا وہ بات بات میں مہر
کشائش گرہِ کینِ دشمناں کے لیے
گہ افتخار مقابل میں اہلِ نخوت کے
گہ انکسار مداراتِ میہماں کے لیے
کہیں ہلاک میں تاخیر قومِ سرکش کے
کہیں نماز میں تعجیلِ ناتواں کے لیے
صفائے قلب حسودانِ کینہ خواہ کے ساتھ
دُعائے خیر بد اندیش و بدگماں کے لیے
کہیں مقدمۃ الجیش انبیاءؑ و رُسل
کہیں وہ خاتمۃ الباب داستاں کے لیے
مدینہ مرجع و ماوائے اہلِ مکہ ہوا
مکیں سے رتبہ یہ حاصل ہوا مکاں کے لیے
اِسی شرف کے طلبگار تھے کلیم و مسیح
نوید۔ اُمتِ پیغمبرِ زماں کے لیے
بس اب نہ غول کا کھٹکا نہ راہزن کا خطر
ہوا وہ قافلہ سالار کارواں کے لیے
شفیعِ خلق سراسر خدا کی رحمت ہے
بشارت اُمتِ عاصی و ناتواں کے لیے
شفاعتِ نبوی ہے وہ برقِ عصیاں سوز
کہ حکم خس ہی جہاں کفر دو جہاں کے لیے
خدا کی ذات کریم اور نبی کا خلقِ عظیم
گنہ کریں تو کریں رخصت انس و جاں کے لیے
اُسی کا دین ہے کہ ہے گلشن ہمیشہ بہار
وگرنہ ہر گل و گلزار ہے خزاں کے لیے
عبور لجۂ عصیاں سے کس طرح ہو۔ اگر
وہ ناخدا نہ ہو اِس بحرِ بیکراں کے لیے
مریضِ حرص و ہوا پائے کب شفا جبتک
وہ چارہ گر نہ ہو اِس دردِ جانستاں کے لیے
نہ حرف و صوت میں وسعت نہ کام و لب میں سکت
حقیقتِ شبِ معراج کے بیاں کے لیے
ارادہ عرش تک اک آن میں پہنچنے کا
کیا تھا عزم اولوالعزم نے کہاں کے لیے
کرم کا دیکھیے دامن کہاں تلک ہو فراخ
ہو میزبان خدا جب کہ میہماں کے لیے
زمیں پہ ٹھیرا ہے ماوائے شاہِ عرش نشیں
رہی نہ اب کوئی فوقیت آسماں کے لیے
اِسی سے ہوتا ہے ظاہر عیار استعداد
محک ہی حُبِّ نبی دل کے اِمتحاں کے لیے

اگر نصیب ہو یثرب میں جا کے شربتِ مرگ   پیوں نہ آبِ بقا عمرِ جاوداں کے لیے
اگر بقیع میں گز بھر زمیں میسّر آئے   کروں نہ طولِ اَمَل روضۂ جناں کے لیے
سمایا اُس کا جو نقشِ قدم تصوّر میں   ہجومِ شوق میں لُوٹے کہاں کہاں کے لیے
حریفِ نعتِ پیمبر نہیں سخن حالی   کہاں سے لائیے اعجاز اِس بیاں کے لیے

نبی کا نام ہو وردِ زباں رہے جب تک
سخن زباں کے لیے اور زباں دہاں کے لیے

۲- ترکیب بند- مرثیہ سنہ ۱۲۸۵ ہجری

مرثیہ جناب مرزا اسد اللہ خاں مرحوم دہلوی متخلص بہ غالبؔ

کیا کہوں حالِ دردِ پنہانی   وقت کوتاہ و قصّہ طولانی
عیش دنیا سے ہو گیا دل سرد   دیکھ کر رنگِ عالمِ فانی
کچھ نہیں جز طلسمِ خواب و خیال   گوشۂ فقر و بزمِ سلطانی
ہے سراسر فریبِ وہم و گماں   تاجِ فغفور و تختِ خاقانی
بے حقیقت ہے شکلِ موجِ شراب   جامِ جمشید و راحِ ریحانی
لفظ مہمل ہے نطقِ اعرابی   حرفِ باطل ہے عقلِ یونانی
ایک دھوکا ہے لحنِ داؤدی   اِک تماشا ہے حُسنِ کنعانی
نہ کروں تشنگی میں تر لبِ خشک   چشمۂ خضر کا ہو گر پانی
لوں نہ اِک مشتِ خاک کے بدلے   گر ملے خاتمِ سلیمانی

بحرِ ہستی بجز سراب نہیں
چشمۂ زندگی میں آب نہیں

جس سے دُنیا نے آشنائی کی   اُس سے آخر کو کج ادائی کی
تجھ پہ بھولے کوئی عبث اے عمر   تو نے کی جس سے بیوفائی کی
ہے زمانہ وفا سے بیگانہ   ہاں قسم ہم کو آشنائی کی
یہ وہ بے مہر ہے کہ ہے اِسکی   صلح میں چاشنی لڑائی کی
ہے یہاں حظِّ وصل سے محروم   جس کو طاقت نہ ہو جُدائی کی
ہے یہاں حفظِ وضع سے مایوس   جس کو عادت نہ ہو گدائی کی
خندۂ گُل سے بے بقا تر ہے   شان ہو جس میں دل رُبائی کی
جنسِ کاسد سے ناروا تر ہے   خوبیاں جس میں ہوں خُدائی کی
بات بگڑی رہی سہی افسوس   آج خاقانی و سنائی کی

رشکِ عُرفی و فخرِ طالب مُرد
اسد اللہ خانِ غالب مُرد

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات   جس کی تھی بات بات میں اک بات
نکتہ داں نکتہ سنج نکتہ شناس   پاک دل پاک ذات پاک صفات
شیخ اور بذلہ سنج شوخ مزاج   رند اور مرجعِ کرام و ثقات
لاکھ مضمون اور اُس کا ایک ٹھٹول   سو تکلّف اور اُس کی سیدھی بات
دل میں چبھتا تھا وہ اگر بمثل   دن کو کہتا دن اور رات کو رات
ہو گیا نقش دل پہ جو لکھا   قلم اُس کا تھا اور اُس کی دوات

تھیں تو دلی میں اُس کی باتیں تھیں   لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات
اُس کے مرنے سے مر گئی دلی   خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات
یاں اگر بزم تھی تو اُس کی بزم   یاں اگر ذات تھی تو اُس کی ذات
ایک روشن دماغ تھا نہ رہا
شہر میں اک چراغ تھا نہ رہا

دل کو باتیں جب اُسکی یاد آئیں   کِس کی باتوں سے دل کو بہلائیں
کس کو جا کر سُنائیں شعر و غزل   کِس سے دادِ سخنوری پائیں
مرثیہ اُس کا لکھتے ہیں احباب   کِس سے اِصلاح لیں کدھر جائیں
پست مضموں ہے نوحۂ اُستاد   کِس طرح آسماں پہ پہنچائیں
لوگ کچھ پُوچھنے کو آئے ہیں   اہلِ میّت جنازہ ٹھیرائیں
لائیں گے پھر کہاں سے غالبؔ   سوئے مدفن ابھی نہ لے جائیں
اس کو اگلوں پہ کیوں نہ دیں ترجیح   اہلِ انصاف غور فرمائیں
قدسی و صائب و اسیر و کلیم   لوگ جو چاہیں اُن کو ٹھیرائیں
ہم نے سب کا کلام دیکھا ہے   ہے ادب شرط مُنہ نہ کھلوائیں
غالبِ نکتہ داں سے کیا نسبت
خاک کو آسماں سے کیا نسبت

نثر حُسن و جمال کی صورت   نظم غنج[۱] و دلال کی صورت
تہنیت اِک نشاط کی تصویر   تعزیت اِک ملال کی صورت

---

[۱] غنج = ادا، ناز   دلال = کرشمہ، غمزہ

قال اِس کا وہ آئینہ جس میں نظر آتی تھی حال کی صورت
اُس کی توجیہ سے بگڑتی تھی شکلِ امکاں محال کی صورت
اُس کی تاویل سے بدلتی تھی رنگِ ہجران و وصال کی صورت
لطفِ آغاز سے دکھاتا تھا سخن اُس کا مآل کی صورت
چشمِ دَوراں سے آج چھپتی ہے انوری و کمال کی صورت
لوحِ امکاں سے آج مٹتی ہے علم و فضل و کمال کی صورت
دیکھ لو آج پھر نہ دیکھو گے غالبِ بے مثال کی صورت

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

شہر میں جو ہے سوگوار ہے آج اپنا بیگانہ اشکبار ہے آج
نازشِ خلق کا محل نہ رہا رحلتِ فخرِ روزگار ہے آج
تھا زمانہ میں ایک رنگیں طبع رخصتِ موسمِ بہار ہے آج
تھی ہر اک بات نیشتر جس کی اُسکی چُپ سے جگر فگار ہے آج
دل میں مدت سے تھی خلش جس کی وہی برچھی جگر کے پار ہے آج
دلِ مضطر کو کون دے تسکیں ماتمِ یارِ غمگسار ہے آج
تلخیِ غم کہی نہیں جاتی جانِ شیریں بھی ناگوار ہے آج
کس کو لاتے ہیں بہرِ دفن کہ قبر ہمہ تن چشمِ انتظار ہے آج

غم سے بھرتا نہیں دلِ ناشاد
کس سے خالی ہوا جہان آباد

نقدِ معنی کا گنج داں نہ رہا   خوانِ مضموں کا میزباں نہ رہا
ساتھ اُس کے گئی بہارِ سخن   اب کچھ اندیشۂ خزاں نہ رہا
ہُوا ایک ایک کارداں سالار   کوئی سالارِ کارداں نہ رہا
رونقِ حسن تھا بیاں اُس کا   گرم بازارِ گل رخاں نہ رہا
عشق کا نام اُس سے روشن تھا   قیس و فرہاد کا نشاں نہ رہا
ہو چکیں حسن و عشق کی باتیں   گُل و بلبل کا ترجماں نہ رہا
اہلِ ہند اب کرینگے کس پر ناز   رشکِ شیراز و اصفہاں نہ رہا
زندہ کیوں کر رہیگا نامِ ملوک   بادشاہوں کا مدح خواں نہ رہا
کوئی ویسا نظر نہیں آتا   وہ زمیں اور وہ آسماں نہ رہا

اُٹھ گیا تھا جو مایہ دارِ سخن
کس کو ٹھیرائیں اب مدارِ سخن

کیا ہے جس میں وہ مردِ کار نہ تھا   اِک زمانہ کہ سازگار نہ تھا
شاعری کا کیا حق اُس نے ادا   پر کوئی اُس کا حق گزار نہ تھا
بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں   سخن اس کا کسی پہ بار نہ تھا
نذرِ سائل تھی جان تک لیکن   درخورِ ہمت اقتدار نہ تھا
ملک و دولت سے بہرہ ور نہ ہوا   قطعہ   جان دینے پہ اختیار نہ تھا
خاکساروں سے خاکساری تھی   سربلندوں سے انکسار نہ تھا
لب پہ احباب سے بھی تھا نہ گلہ   دل میں اعدا سے بھی غبار نہ تھا
بے ریائی تھی زہد کے بدلے   زہد اُس کا اگر شعار نہ تھا

مظہرِ شانِ حسنِ فطرت تھا
معنیٔ لفظِ آدمیت تھا

کچھ نہیں فرق باغ و زنداں میں   آج بلبل نہیں گلستاں میں
شہر سارا بنا ہے بیتِ حزن   ایک یوسف نہیں جو کنعاں میں
مُلک یکسر ہوا ہے بے آئیں   اِک فلاطوں نہیں جو یوناں میں
ختم تھی اِک زباں پہ شیرینی   ڈھونڈھتے کیا ہو سیب و رُماں میں
حصر تھی اِک بیاں میں رنگینی   کیا دھرا ہے عقیق و مرجاں میں
لبِ جادو بیاں ہوا خاموش   گوشِ گل وا ہے کیوں گلستاں میں
گوشِ معنی شنو ہوا بے کار   مرغ کیوں نعرہ زن ہے بُستاں میں
وہ گیا جس سے بزم روشن تھی   شمع جلتی ہے کیوں شبستاں میں
نہ رہا جس سے تھا فروغِ نظر   سرمہ بنتا ہے کیوں صفاہاں میں

ماہِ کامل میں آگئی ظلمت
آبِ حیواں پہ چھا گئی ظلمت

ہند میں نام پائیگا اب کون   سکہ اپنا بٹھائے گا اب کون
ہم نے جانی ہے اُس سے قدرِ سلف   اُن پہ ایمان لائے گا اب کون
اُس نے سب کو بھلا دیا دل سے   اُس کو دل سے بھلائیگا اب کون
تھی کسی کی نہ جس میں گنجائش   وہ جگہ دل میں پائیگا اب کون
اُس سے ملنے کو یاں ہم آئے تھے   جا کے دلّی سے آئیگا اب کون
مر گیا قدر دانِ فہمِ سخن   شعر ہم کو سنائے گا اب کون

مرگیا تشنۂ مذاقِ کلام   ہم کو گھر سے بلائے گا اب کون
تھا بساطِ سخن میں شاطر ایک   ہم کو چالیں بتائے گا اب کون

کم لنا فیہ من بکی و عویل
و عتابٍ مع الزمانِ طویل

۴۔ قصیدۂ نعتیہ[1]

میں بھی ہوں حسنِ طبع پر مغرور   مجھ سے اٹھیں گے اُن کے ناز ضرور۔
خاک ہوں اور عرش پر ہے دماغ   مجھ سے برتر ہے میری طبعِ غیور

---

[1] اس قصیدہ کی تمہید ۱۲۸۷ھ یا ۱۲۸۸ھ کے ہذیانات میں سے ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے کہ دلی میں نامور شعرا کا خاتمہ ہو چکا ہے۔ مومن۔ ذوق۔ آرزو۔ غالب اور شیفتہ ایک کے بعد ایک رخصت ہو چکے ہیں اور میدان بالکل خالی ہے۔ انھیں دنوں میں سیتارام کے بازار میں ایک مشاعرہ قرار پایا۔ مصرع طرح پر تین غزلیں بڑے دعوے سے لکھیں جن دوستوں کی جا و بیجا تحسین و آفرین سے دماغ میں خلل آگیا تھا اور جن کی داد کی توقع پر وہ غزلیں لکھی تھیں وہ کسی وجہ سے باوجود اصرار کے مشاعرہ میں نہ آئے۔ بیسوا اپنے خریدار کی بے التفاتی سے شاید ایسی کھسیانی نہیں ہوتی جیسا کہ شاعر ان لوگوں کی بے التفاتی سے جن کو وہ سچ مچ اپنے شعر کا قدرداں سمجھتا ہے۔ اسی خام خیالی کے جوش میں اس قصیدہ کی فخریہ تمہید لکھی گئی تھی۔ مطلب یہ تھا کہ اگر لوگ ہماری قدر نہیں کرتے تو ہم آپ ہی اپنے منہ میاں مٹھو بنتے ہیں۔ کیونکہ اس زمانہ کے خیالات کے موافق اس بات کا یقین تھا کہ جس طرح تجارت کی گرم بازاری اشتہارات کے ذریعہ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح شاعری بھی منوانے سے مانی جاتی ہے لیکن جب تفاخر حد سے زیادہ بڑھ گیا تو دفعۃً اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ لہذا قصیدہ کا خاتمہ نعتیہ اشعار پر کیا گیا تاکہ فخر کے لیے ایک وجہ پیدا ہو جائے۔ ۱۲

خاکساری پہ میری کوئی نہ جائے
میرے دل میں بھرا ہوا ہے غرور
چشمۂ آبِ خضر کی مانند
چشمِ اہلِ جہاں سے ہوں مستور
دل سے داد اپنی لے چکا ہوں بہت
مجکو پروا نہیں کہ ہوں مشہور
مثلِ یوسف دکھائے جو ہنرِ ذات
جس کو بکنا ہو مفت یاں منظور
جیسے شہباز ہو قفس میں اسیر ۱
ہوں زمانہ کے ہاتھ سے مجبور
کبک و قمری کو رخصتِ پرواز ۲
بال و پر مفت صعوہ[1] و عصفور
جو نہ سمجھے مجھے کہ کیا ہوں میں
اُس سے شکوہ نہیں کہ ہے معذور
لذتِ مے سے جو نہ ہو آگاہ
اُس کو کیا قدر خوشۂ انگور
جس کی آنکھیں نہ ہوں وہ کیا جانے
روز روشن ہے یا شبِ دیجور
پہلے ہوگی کسی کو قدرِ ہنر
اُٹھ گیا اب جہاں سے یہ دستور
دردِ دل کا بیاں کروں کس سے
بات کھوئی نہیں مجھے منظور
سخنِ حق کی داد لوں کس سے
سُن چکا ہوں فسانۂ منصور
دلِ آباد مفت بے ہنراں
ہو چکا خانۂ ہنر معمور
مژدہ خسرو کو وصلِ شیریں کا
ہو چکی سعیِ کوہکن مشکور
ہم نے دیکھی تمیزِ اہلِ ہنر
ہم نے دیکھا مذاقِ اہلِ شعور
ہے غرض ان کو صوتِ موزوں سے
نالۂ دل ہو یا نوائے طیور
ہو کسی شے سے ان کی گرمیِ بزم
داستاں ہو وہ یا کہ درسِ زبور
ہے فقط روشنی سے ان کو کام
موم ہو اصل شمع یا کافور
ہے یہاں قائلِ "انا" مردود
ہو وہ فرعونِ وقت یا منصور

---

[1] ممولا = ایک ننھی چڑیا (ابلق رنگ)

آپ اپنے سخن سے ہوں محظوظ
دلِ اصحاب گو نہ ہو مسرور
یاں اگر کام ہے تو شیریں سے
قصرِ خسرو کے اور ہیں مزدور
دلِ احباب پر نہیں چلتا
سحر میرا کہ رہیو غیر سے دور
ہوں تماشائے شہرِ نابینا
ہے برابر مرا خفا و ظہور
دُرِ یکتا ہوں اور ہوں بے آب
ماہِ کامل ہوں اور ہوں بے نور
چشمہ پیدا و کارواں تشنہ
بادہ پُر زور و انجمن مخمور
اس زمانہ میں وہ غریب ہوں میں
جو وطن سے ہو لاکھ منزل دور
صاحبِ قدر و جاہ ہے جب تک
کارفرما ہے چین میں فغفور
کاش اُس عہد میں مجھے پاتے
تھا سخن جب کہ قبلۂ جمہور
کاش واں دیکھتے مجھے کہ جہاں
متنبی[1] تھا مادحِ کافور[2]
کون سمجھے مجھے کہ ہوں کیا چیز
انوری ہے نہ عرفی و شاپور
کون دیکھے مرے چمن کی بہار
مرگیا عندلیبِ[3] نیشاپور
جس سے ہوتا ہے خستہ سینۂ ہوش
ہے زباں میری وہ دمِ ساطور[4]
جس سے ہوتا ہے کور پروانہ
ہے مری شمع میں وہ لمعۂ نور
شرح نقطہ کی گر کروں تحریر
تنگ ہو عرصۂ نقوش و سطور
ترکِ عشقِ بتاں کریں عشّاق
مجھ سے سُن پائیں گر ستائشِ حور
گر کروں ذکرِ لذّتِ طاعات
تلخ کر دوں مذاقِ فسق و فجور

---

[1] ابو الطیب احمد بن حسین معروف بہ متنبّی چوتھی صدی ہجری کا مشہور عربی شاعر۔ ۱۲

[2] کافور اخشیدی والی مصر جس کی مدح میں متنبی نے قصیدے لکھے ہیں۔ ۱۲

[3] عندلیبِ نیشاپور سے مراد نظیری ہے لیکن اگر وہ ہوتا تو اس سے زیادہ اور کیا قدر کرتا جیسا کہ شیخ علی حزیں نے سودا کی نسبت کہا تھا کہ در پوچ گویانِ ہند غنیمت است۔ ۱۲

[4] چھرا۔ ۱۲

چھیڑ دوں گر فسانۂ فرہاد
دلِ خسرو میں ڈال دوں ناسور
کرنے جاؤں جو حق سے عذرِ گناہ
لے کے آؤں نویدِ عفوِ قصور
لوں ملائک سے دادِ حسنِ کلام
گر لکھوں نعتِ سرورِ جمہور
وہ شہنشاہ۔ اُمتی جس کا
یاں گنہگار اور وہاں مغفور
وہ خداوند۔ خدمتی جس کا
یاں شبکار اور وہاں ماجور
مژدہ اے اُمتِ ضعیف کہ یاں
سعی ہوتی ہے بے کیے مشکور
لبِ شیریں کلام سے اُس کے
دوست بھی شاد غیر بھی مسرور
اثرِ فیضِ عام سے اُس کے
کعبہ آباد و میکدہ معمور
چرخ کو دے اگر وہ حکمِ سکوں
ہو غلط نسخۂ سنین و شہور
صرصرِ قہر گر چلے اُس کی
بند ہو مسلکِ صبا و دبور[1]
جس طرف ہو وہ گرمِ نظارہ
جلوہ گر ہو اُدھر سے لمعۂ طور
ہو جہاں لطف سے وہ سایہ فگن
موجزن ہو وہاں سے چشمۂ نور
بات پوچھو تو سوئے چرخ نگاہ
سینہ دیکھو تو علم کا گنجور
ہو سکے اُس کی خوبیوں کا شمار
نعمتیں حق کی ہوں اگر محصور
اے ترا پایہ فہم سے برتر
اے ترا نام عرش پر مسطور
ہیں ترے در پہ سُن کے آیا ہوں
نام تیرا شفیعِ روزِ نشور
کچھ نہیں زادِ راہ پاس اپنے
مگر اُمیدِ عفوِ ربِّ غفور
طبعِ غالب ہے اور میں مغلوب
نفس قاہر ہے اور میں مقہور

---

[1] پچھوا ہوا۔ ۱۲

بحرِ غفلت میں ہوں سراسر غرق نشۂ کبر میں ہوں بالکل چور
چھوڑتی ہی نہیں خودی دامن ہوں بہت اپنے ہاتھ سے مجبور
مہرِ فرزند و خواہشِ زر و سیم طمعِ جاہ و فکرِ عیش و سرور
ایک بیمار اور سو آزار ایک رنجور اور سو ناسور
نفسِ امّارہ اور دیوِ[1] مُرید یہ ہے افعی تو وہ ہے کلب عقور[2]
مجھ سے جو کام چاہیئے لیجے جھوٹ ہو یا فریب یا ہو زور
حسد و بغض و غیبت و بہتاں بخل و حرص و ہوا و فسق و فجور
ایک جو مجھ سے بن نہیں آتی ہے وہ خدمت کہ جس پہ ہوں مامور
دل لگے بندگی میں کیا امکاں لب ہے ذکرِ حق میں کیا مذکور
مایۂ عقل ہے نہ شورِ جنوں دلِ بیتاب ہے نہ جانِ صبور
نہ معاصی میں تلخئ خجالت نہ عبادت میں چاشنئ حضور
فی المثل ہے مری مسلمانی جیسے زنگی کا نام ہو کافور
ہاں مگر کچھ اُمید بندھتی ہے تیرے زُمرے میں گر ہوا محشور
جب ترے کارواں میں جا پہنچا پھر رہا بابِ خلد کتنی دور
دوریٔ آستانِ والا سے ہے بہت تنگ حالیِ مہجور
جا لگے تیرے در پہ کشتئ عمر جب کہ ہو بحرِ زندگی سے عبور
جیتے جی دل میں یاد ہو تیری
مرتے دم لب پہ ہو ترا مذکور

---

[1] دیو = شیطان مُرید = سرکش دیو مرید سے مراد ابلیس ہے۔

[2] عقور = کاٹ کھانے والا۔

۴۴۔ قصیدہ[1] مدحیہ ناتمام

نواب کلب علی خاں مرحوم رئیس رامپور کی شان میں

ظلِّ حق کلب علیخاں جسکے بذل و جود پر ہند سے لے تا عرب ہیں خاصی و عامی گوا
صاحبِ علم و عمل اور تابعِ احکامِ دیں زائرِ قبرِ نبی اور حاجیِ بیت الہدیٰ
شاعری میں فرد موسیقی میں فارابی عصر صوت روح افزا و صورت آیۂ صنعِ خدا
دولتِ برطانیہ پر اُس کی فرزندی کا حق دولتِ عثمانیہ کو اُس سے پیوند وِلا
اُس کی ہیبت سے لرزتے ہیں مقرب و جلیس اور مروّت پر ہیں نازاں مجرم و اہلِ خطا
مرجعِ اربابِ علم و فن ہے اس کا بابِ فیض ۱ یہ وہ دعوی ہے کہ خود دربار ہے اس کا گوا
گلزمینِ ہند میں تھے جو درختِ باروار ۲ اُن کو چُن چُن کر یہاں لایا چمن بندِ سخا
گر مناظر ہیں تو ہیں سردفترِ اہلِ کلام ۳ اور محدث ہیں تو ہیں سرچشمۂ اہلِ ہدی
زمرۂ اہلِ یقیں یا مجمعِ اہلِ سلوک نکتہ چینانِ مجسطی خردہ گیرانِ شفا
شاعرِ شیریں نفس یا شاطرِ سنجیدہ رائے فیلسوفِ مستدل یا عارفِ علّت رُبا
بے بدل ہے الغرض جو روپ ہے اس باغ میں بُلبلِ جادو نوا ہو یا گلِ رنگیں ادا

---

[1] یہ قصیدہ سنہ ۱۲۹۱ھ میں اُس وقت لکھا گیا جبکہ نواب ممدوح علی گڑھ کے مدرسۃ العلوم کا پیٹرن ہونا منظور کر چکے تھے اور بارہ سو روپیہ سال کی جاگیر ہمیشہ کے لیے مدرسہ کے اخراجات کے واسطے اور کئی ہزار روپیہ نقد بطور چندہ کے دے چکے تھے مگر مصلحۃً اُن کی خدمت میں بھیجا نہیں گیا اور اسی لیے ناتمام رہا اس کے اول و آخر کے کچھ اشعار ضائع بھی ہو گئے ہیں۔

بہرہ ور ہیں فیض سے تیرے بلاد دور دست
بارِ محصولات سے یاں تک ہوئی ہلکی کہ اب

خیر تیری ہے حصارِ عافیت تیرے لیے
نعمتیں حق کی نہ سمٹیں گی سمیٹے زینہار

خوانِ نعمت پر ہے تیرے میہمانوں کا ہجوم
ہے یقیں تجھ پر پڑے اصحابِ محشر کی نگاہ

دولت اقبال روز افزوں سے تیرے ہے عیاں
پرورش پاتی تھی جن کے سایۂ دولت میں قوم

کچھ گھرانے رہ گئے ہیں جو کہ آتے ہیں نظر
یہ اگر ہوتے نہ کشتیبان اس طوفان میں

رہ گئی تیری خریداری سے شرم اہلِ فضل
مل گئے رکھتے گوہرِ درجِ شرافت خاک میں

ہو گئے تھے دودمانِ علم و دولت جاں بلب
گود میں پودا لگا ہے جو پئے تہذیبِ قوم

ہے یہ وہ احسان جس کے بارِ منت سے کبھی
تیرے ظلِ تربیت میں گر رہا یہ نونہال

فرض اگر کیجے اُسے دیوار کاخِ آرزو
اور اگر کہیے کہ ہے یہ قوم کی گشتہ مراد

اے خوشا وہ سرزمیں جس پر ہو تو فرماں روا
بارِ منت سے ترے پشتِ رعیت ہے دوتا

سیر ہو کر تجھکو دیتے ہیں بہت بھوکے دُعا
ہر بھلائی کی ملی وہ چند گر تجھکو جزا

نام پھر زندہ ہوا خوانِ خلیل اللہ کا
جب نہیں کس نے کیا حق میزبانی کا ادا

جو کہ حامی قوم کے ہیں اُن کا حامی ہے خدا
لے گئی اُن کو بہا کر موجِ سیلابِ فنا

ہند میں اب تکیہ گاہِ اُمتِ خیر الوریٰ
کشتیِ اسلام تھی منجدھار میں بے ناخدا

ورنہ ان کی جنس کا گاہک یہاں کوئی نہ تھا
خاک سے تو نے اُٹھایا ان کو اور بخشی جلا

تو نے ایک اِک کے چوایا حلق میں آبِ بقا
آبیاری سے ہے تیری ہی اسے نشو و نما

قوم کی گردن نہ ہلکی ہوگی سے رہتے دریا
ہے یقیں پھیلیں گی شاخیں اُسکی طوبیٰ سی سوا

تو وہ پشتیباں ہے جس سے اسکی قائم ہے بنا
تو ہے اُس پر ابرِ رحمت کی طرح چھایا ہوا

قصیدۂ[1] ناتمام مرقومہ ۱۲۹۴ھ

سرسید احمد خاں دام بقاؤہم کی شان میں

پنہاں نہیں ہے یارو سب پر کھلا ہوا ہے
جو حال آج اپنا اور اپنی قوم کا ہے

ہے اک لکیر باقی جس پر فقیر ہیں ہم
خود سانپ تو یہاں سے کب کا نکل گیا ہے

اِس پر بھی اے عزیزو۔ ہے جائے فخر تم کو
دنیا میں دینِ بیضا حق نے تمھیں دیا ہے

قبلہ ہے وہ تمھارا جو گھر ہے سب سے پہلا
ہادی ہے وہ تمھارا جو ختم انبیا ہے

دی ہے وہ مصلحِ کل حق نے کتاب تم کو
جس نے شریعتوں کو تغیر و نسخ کیا ہے

بخشی تمھیں حکومت۔ حکمت تمھیں عطا کی
دوراں سدا موافق تم سے یونہیں رہا ہے

اِس دورِ آخری میں جب یوں بگڑ چلے تم
اک ہاشمی تمھارا مصلح کھڑا کیا ہے

سرسبز چاہتا ہے جو قوم کو جہاں میں
فتووں سے قوم کے گو کافر ٹھہر چکا ہے

وقت اپنا کام اپنا جان اپنی مال اپنا
یاروں پہ جس نے سب کچھ قربان کر دیا ہے

وار اُس پہ قوم کے ہیں۔ وہ قوم کی سپر ہے
قوم اُس سے بدگماں ہے وہ قوم پر فدا ہے

درہم سے اور قلم سے۔ دم سے قدم سے اپنے
جو کچھ کیا ہے اُس نے وہ کس سے ہو سکا ہے

ہمدردِ قوم ایسا ہم نے سنا نہ دیکھا
یہ درد اُس کو جد کی میراث میں ملا ہے

تعلیم کی تمھاری بنیاد اُس نے ڈالی
ملکوں میں جس کا چرچا ہر سمت ہو رہا ہے

بعد از قرونِ اولیٰ کس نے کیا بتاؤ
سید نے کام آکر جو قوم میں کیا ہے

---

[1] یہ قصیدہ اس وقت لکھنا شروع کیا گیا تھا جبکہ مدرسۃ العلوم کا بنیادی پتھر لارڈ لٹن اپنے ہاتھ سے رکھ چکے تھے اور سرسید کے کام تحسین کی نگاہ سے دیکھے جانے لگے تھے۔ مگر بہ سبب اکثر مہمات دنیوی کے پورا نہو

٦۔ قطعہ مرثیہ ۱۳۰۳ھ

مرثیہ مہین برادر راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم

کل سوگ میں بھائی کے اُسے دیکھ کے چپ چاپ
حالی سے کہا ہم نے کہ اے سحرِ معانی
خاموش کبھی ہمنے تجھے یوں نہیں دیکھا
کیا ہو گئی وہ تیری طبیعت کی روانی
شادی میں تری تہنیتیں ہمنے سُنی ہیں
ماتم میں بھی دیکھی ہے تری مرثیہ خوانی
ہنسنا ہے نہ رونا ہے نہ بذلہ ہے نہ نوحہ
کچھ کہہ تو سہی دل میں یہ کیا تو نے ہے ٹھانی
دنیا ہے یہ اِک دارِ فنا جس کا اثاثہ
سب خاک سے تا انجم و افلاک ہے فانی
ہو جائے گر انساں یونہیں ہر رنج میں خاموش
کِس طرح دلوں کے ہوں عیاں رازِ نہانی
اِک آہ بھری سُن کے یہ حالی نے کہ جس سے
دِل ہل گئے اور سب کے لہو ہو گئے پانی
فرمایا کہ موجوں سے بھنور کی نہیں آگاہ
ساحل پہ ہیں جو [illegible] سپہر تا صحی دانی
حالی ہی کو معلوم ہے حالی کی حقیقت
مشکل ہے کسک دل کی عزیزوں کو دکھانی
آئے ہیں سدا بھائیوں سے بھائی بچھڑتے
موت ایک کے آگے ہے ضرور ایک کو آنی
پر بھائی ہو جس شخص کا حالی کا سا بھائی
غم بھائی کا مرجانے کی ہے اُس کے نشانی
جس بھائی نے بیٹوں کی طرح بھائی کو پالا
سوکھی ہوئی کھیتی میں دیا باپ کی پانی
جس بھائی کی آغوش میں ہوش اُس نے سنبھالا
جس بھائی کے سایہ میں کٹی اُس کی جوانی
شفقت نے دیا جس کی بھلا مہرِ پدر کو
دی آنے کبھی دل پہ نہ بھائی کے گرانی
جیتا بھی رہا بھائی گر اُس بھائی کے پیچھے
لذّت نہیں جینے سے نصیب اُس کو اٹھانی
دل مردہ ہو حالی کی طرح جس کا عزیزو
کیا ڈھونڈھتے ہو اُس کی طبیعت میں روانی

یہ چیپ نہ لگائے کسی دشمن کو بھی اللہ   یہ چیپ نہیں مرجانے کی ہے دل کے نشانی
بولیں گے بھی سو بار ہنسیں گے بھی جہاں میں   یہ تاؤ سہے ہر طرح ہیں پار لنگھانی
پر آہ۔ کلی وہ جو ہے مرجھا گئی دل کی   مشکل ہے وہ ہمیں پھول کے آپس میں کھلانی

باقی رہے گا داغ سدا بھائی کا دل پر
ہر چند کہ فانی تھا وہ اور ہم بھی ہیں فانی

قطعہ مرتبہ ۱۳۰۵ھ

بجناب نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

آسمان جاہ کی خدمت عالی کی ہے عرض   کہ اگر میرا ہر اک رونگٹا ہو جائے زباں
شکر ممکن نہیں اس کا کہ مجھے گھر بیٹھے   اُس نے ممتاز کیا بھیج کے شاہی فرماں
نہ ہوئی مجھ سے کوئی خدمت سرکار نظام   نہ کیا میں نے کبھی طوف در صدر زماں
نہ کوئی مجھ میں ہنر ایسا کہ ہو لائق قدر   اور نہ ایسا کوئی جوہر جو ہو قیمت میں گراں
حق نہ تھا دولت عالی پہ کوئی حالی کا   جسکے جلدو میں وہ اس لطف کا ہوتا شایاں
ہاں مگر ذات میں ہے فیض رسانی جن کی   ڈھونڈھ لیتے ہیں کوئی حیلہ برائے احساں
ہیں مربی ہنر و بے ہنری کے جس طرح   خار و گل دونوں کو کرتا ہے نہال آب رواں
آسماں جاہ کا اک میں ہی نہیں شکر گذار   ملک میں اُس کا ثنا خواں ہے ہر اک پیر و جواں
ہاں وہ اُن کھیتوں کو دے کے گیا ہے پانی   آنکھ اسلام کی خود جن کی طرف ہے نگراں
قوم اس وقت ہے تعلیم کی جتنی محتاج   ہے وہ عالم پہ ہویدا۔ نہیں محتاج بیاں
عزت۔ آسودگی اور ملت و مذہب اُن کا   ہو نہ تعلیم تو ہیں سب کوئی دن کے مہماں

پھر نہ قدر اُن کی کچھ آنکھوں میں خلائق کی بلند
اور نہ وزن اُن کا ترازو میں حکومت کی گراں
آسماں جاہ پہ برکت ہو خدا کی جس نے
درد کا جان لیا اُن کے کہ یہ ہے درماں
مدرسے قوم کے اس ملک میں جو ہیں ممتاز
جن میں کچھ کچھ نظر آتے ہیں ترقی کے نشاں
اُن کی امداد سے نواب نے کی ہے قائم
چشمِ عالم میں مسیحائی پہ اپنی برہاں
کرتے ہیں زندۂ جاوید بنی نوع کو جو
بذل کرتے ہیں پئے تربیتِ اہلِ زماں
ہے مدارس کی اعانت وہ نکوئی جس کا
ملک پر قوم پہ تا دیر رہے گا احساں
یہی بخشش ہے یہی جود ہے راس الحسنات
جس پہ موقوف ہے بہبودیِ نسلِ انساں
یہی امداد ہے جس سے ہوئیں قومیں سرسبز
یہی تدبیر ہے جس سے ہوئے ملک آباداں
یہی قوت ہے کہ ہوتے ہیں قوی جس سے ضعیف
یہی حکمت ہے کہ ہوتے ہیں سُبک جس سے گراں
ق دی لگا ایک نے پانی کی سرِ راہ سبیل
کی ہمیشہ کے لیے ایک نے واں نہر رواں
اُس کی خواہش تھی کہ جیتے رہیں پیاسے سیراب
اُس نے چاہا کہ رہے پیاس کا باقی نہ نشاں
برکتیں علم کی جو ملک میں پھیلاتے ہیں
نہر جاری سے ہے ذات اُن کی سوا فیض رساں
بخت اُس ملک کے جس ملک میں ایسا ہو وزیر
حامیِ علم و خریدارِ کمالِ انساں
اب خدا سے یہ دعا ہے کہ جہاں میں جب تک
شکر احسان کا کرتے رہیں بعد از احساں
آسماں جاہ سے ہو تقویتِ مُلکِ دکن
اور رہے مُلکِ دکن ملجا و ماوائے جہاں
دولتِ قیصری و دولتِ آصفجاہی
ایک کی ایک زمانہ میں رہے پشتیباں

۸۔ قصیدہ مرتبہ سنہ ۱۳۰۶ھ

تہنیت عیدالفطر۔ بہ جناب نواب سر آسمان جاہ مدار المہام سرکار عالی

مہِ صیام گیا اور روزِ عید آیا   خوشی کا عید کی حق ہر کوئی بجا لایا
کیا خدا کا ادا شکر روزہ داروں نے   کہ اپنے صبر کا انعام ہم نے بھر پایا
رہینِ منتِ ساقی ہیں بادہ خوار تمام   کہ تیس روز کے پیاسوں کا روزہ کھلوایا
گئے ہیں ایسے مساجد سے معتکف خوش خوش   کہ جیسے طفل ہو مکتب سے چھوٹ کر آیا
شگفتہ آتے ہیں اس طرح عیدگاہ سے لوگ   کہ گنج اُنھوں نے ہے گویا خرابہ میں پایا
حسین جامے میں پھولے نہیں سماتے آج   کہ دن خدا نے نمایش کا اُن کو دکھلایا
عزیز و دوست گلے ملتے پھرتے ہیں باہم   خدا نے سیکڑوں روٹھوں کو آج منوایا
حکیم ہیں متفکر نہ زاہد افسردہ   خوشی نے دی ہے زمانہ کی کچھ پلٹ کایا
غنی ہیں شال میں مست اور گدا ہیں کھال میں مست   ہر ایک خوان سے منعم نے سب کو چکھوایا
اِدھر ہے فصلِ بہار اور اُدھر ہے عیدالفطر   سماں نشاط کا ہے شہر و دشت پر چھایا
کھلے ہیں اسکے عوض دشت میں کروڑوں پھول   جو غم سے شہر میں آج ایک دل ہے کُملایا
ہزاروں سروِ خراماں ہیں شہر میں ہر سو   جو دشت میں کوئی پودا ہے آج مُرجھایا
اگر خوشی کا زمانہ کی ہے یہی عالم   تو سمجھو غم کا عوض غمزدوں نے بھر پایا
مگر یہ عاریتی انبساط ہے سب ہیچ   اس انبساط پہ غافل ہے جو کہ اترایا
فریفتہ ہوئے جو ایسی خوشیوں پر   اُنھوں نے آب کا دھوکا سراب پر پایا
خوشی ہے جس سے عبارت وہ ہے خوشی اُنکی   جنھوں نے خلق میں ذکرِ جمیل پھیلایا

جنھوں نے دین کے گرتے ستون کو تھاما
جنھوں نے علم کا بجھتا چراغ اُکسایا

جنھوں نے ملک کے امراض کو کیا تشخیص
جنھوں نے قوم کے افسردہ دل کو گرمایا

جنھوں نے خُلق سے اپنا بنایا غیروں کو
جنھوں نے لطف سے وحشی دلوں کو پرچایا

خبر مریضوں کی لی جاہلوں کو دی تعلیم
کھلایا بھوکوں کو بے پوششوں کو پہنایا

ہوا زمین پہ جس سال آسماں ممسک
مینھ اپنی داد و دہش کا اُنھوں نے برسایا

ہوائے دہر اگر ہو گئی کبھی فاسد
فضائے دہر کو خلقِ حسن سے مہکایا

سدا غریبوں کی امداد پر رہیں جو تیار
لیا سنبھال اُسے جس نے ہاتھ پکڑایا

ہمیشہ مانگنے والوں کو بے دریغ دیا
نہ مانگ سکتے تھے جو اُن کے گھر پہ پہنچایا

نہ سمجھا آپ کو اِک پاسبان سے بڑھ کر
اُنھوں نے لطفِ حکومت اِسی میں کچھ پایا

نہ پانی کھانے میں لذّت نہ چین سے سوئے
ستم رسیدہ کا جب تک کہ حق نہ دلوایا

وِغا میں شیر مگر وقتِ رحم مورِ ضعیف
کسی کی آہ سُنی اور دل اُن کا بھر آیا

وہ سمجھے یہ کہ کوئی قافلہ ہوا تاراج
جو شاہراہ میں پتّا کسی نے کھڑکایا

وہ چونک اُٹھے کہ گویا قیامت آ پہنچی
جو در پہ آکے کوئی داد خواہ چلّایا

نشاط و عشرتِ جاوید کی ہے اُن کو نوید
دل ایسا جن کو عنایت خدا نے فرمایا

سُنا تھا کان سے جو ذکرِ خیر عہدِ سلف
سو آنکھ سے وہ وزیرِ دکن نے دکھلایا

بشیرِ دولت و دیں صدرِ اعظمِ اُمرا
نہیں ہے جس کا کوئی قربِ شہ میں ہم پایا

جو ظلِّ حق ہے رعیّت کے سر پہ شاہِ دکن
تو اعظم الامرا ظلّ حق کا ہے سایا

ہمیشہ جس کو ہے بہبودِ مُلک مدّ نظر
رفاہ و امن ممالک میں جس نے پھیلایا

اُٹھایا فتنہ نے جب سر فرو کیا اُس کو
پڑا عمل میں جہاں عقدہ اُس کو سُلجھایا

بنائے نظم و نسق جس نے رکھی شوریٰ پر
مشیرِ کار خرد و پیر دروں کو ٹھیرایا
دکن کو جس نے کیا مرجعِ خواص و عوام
دکن کا جس نے کہ ڈنکا جہاں میں بجوایا
نہ کوئی ملک میں سرکش رہا نہ نافرمان
جفا و ظلم کو توڑا غرور کو ڈھایا
بل انتظام کے رشتہ میں پڑ رہے تھے بہت
سو تکلے کی طرح ایک ایک بل نکلوایا
لگا گئے تھے وزیرانِ رفتہ جو پودا
وہ صاحبی میں وزیرِ زماں کی پھل لایا
ترقی اب یہ تمدّن میں کی ہے بلدہ نے
کہ اپنی حالتِ پیشیں سے خود ہے شرمایا
زمانِ حال سے ماضی کو دیجے کیا نسبت
اندھیری چھائی ہوئی تھی کہ دن نکل آیا
خدا دراز کرے عمر **اعظم الامرا**
دکن کو جس کی حکومت نے دن یہ دکھلایا
زمیں پہ سایہ فگن جب تلک آسمان رہے
رہے دکن پہ حضورِ **نظام** کا سایا
تھی کوئی چیز نہ **حالی** کے پاس لائقِ نذر
سو یہ چگامۂ ناچیز پیشکش لایا
یہی بس اس کے لیے ہوگا مایۂ نازش
جو **اعظم الامرا** نے قبول فرمایا

۹۔ قطعہ مرتبہ ۱۳۰۸ھ

تہنیت ولادت فرزند ارجمند در شبستانِ اقبال جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر
مدار المہام سرکارِ عالی

فیضِ ربِّ ذو المنن سے مژدہ اے اہلِ دکن
نائبِ دولت کا نخلِ آرزو لایا ثمر
دی **بشیر دولت و دیں** کو وہ چیز اللّٰہ نے
جس سے پایا دیدۂ **یعقوبؑ** نے نورِ بصر
جس کو پیری کا عصا سمجھا **خلیل اللّٰہ** نے
حق نے دی جس کے عطا ہونے کی سارا کو خبر
جس کے ملنے سے ہوا داؤدؑ ممنونِ قضا
جس کے پانے سے ہوا ایوبؑ مرہونِ قدر

جس کے بدلے ہیں علی الرغم شماتت پیشگاں
حق سے ختم الانبیا نے پائے شبیر و شبر
جو بضاعت ہی گدائی اور دولت شاہ کی
جو ہے حاصل عمر کا اور زندگانی کا ثمر
جس سے مستغنی ولی ہیں اور نہ عارف بے نیاز
جس سے ہیں اجداد زندہ اور امجد نامور
صدرِ اعظم کو دیا صد شکر خالق نے خلف
خلق کی آخر دعاؤں کا ہوا ظاہر اثر
یہ پسر یارب بحقِ عزتِ خیر الوریٰ
پائے عمرِ خضر زیرِ سایۂ مہرِ پدر
صدرِ اعظم کی طرح دربار آصف جاہ میں
پایگاہِ قربِ سلطانی ہو اُس کا مستقر
دولت و ثروت کو اسکی ذات سے لگجائے شان
زیورِ علم و ادب سے ہو مُحلّے اِس قدر
سیرت و عادت میں اُسکی نکلے آن اجداد کی
جوہرِ اخلاقِ فاروقی[1] ہوں اُس میں جلوہ گر
ملکِ آصف جاہ میں سر آسمان جاہ اور وہ
رات دن رکھیں اُجالا صورتِ شمس و قمر

۱۰ قصیدہ[2] مرتبہ سنہ ۱۳۰۹ھ

اے صفر کی دوسری - روزِ دوشنبہ مرحبا
ہم نہ بھولیں گے کبھی وہ تیری صبحِ جانفزا
ہم نے رکھا آکے جب بلدہ کی سرحد میں قدم
پھر گیا آنکھوں کے آگے اپنی اِک عالم نیا

---

[1] اِس میں یہ اشارہ ہے کہ نواب سر آسمان جاہ بہادر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی اولاد میں ہیں - ۱۲

[2] یہ قصیدہ ماہ ستمبر سنہ ۱۸۹۱ء مطابق صفر سنہ ۱۳۰۹ھ مقام حیدر آباد دکن جبکہ ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر مع اکثر رفقا کے جن میں سے ایک راقم بھی تھا بطور ڈیپوٹیشن کے محمڈن کالج علی گڑھ کی طرف سے حضور سرکار نظام میں حاضر ہوئے تھے ایک جلسہ عام میں پڑھا گیا تھا جس کے صدر انجمن نواب وقار الامرا بہادر تھے ۱۲ حالی

عزتِ قومی۔ ترستی تھیں سدا آنکھیں جسے   اُسکے کچھ آثار دیکھے ہم نے یاں شکرِ خدا
کھوج میں جس فخر کے پھرتے تھے اِک مدّت سے ہم   آکے بلدہ کے سوا نہیں لگا اِس کا پتا
بھیک کو نکلے تھے گھر سے کچھ بھکاری قوم کے   جھولیاں ڈالے گلے میں در بدر دیتے صدا
پہنچے لینے اُن کو وہ اعیانِ دار الملک سے   دولتِ عالی کو جن کی ذات پر ہے اِتّکا
قوم پر ہے جن کو فخر اور ملک کو ہے جن پہ ناز   سلطنت کے جو ہیں اعضا اور وزارت کے قویٰ
صدرِ اعظم نے ہمیں بخشا اقامت کے لیے   وہ سرابستاں خجل ہو جس سے جنّت کی فضا
ہم غریبوں کو سمجھکر اِک سفارت قوم کی   دی وہ عزّت۔ شکر جس کا ہو نہیں سکتا ادا
پیشتر مہماں نوازی کا فقط سُنتے تھے نام   آکے یاں سمجھے کہ ہے مہماں نوازی چیز کیا
کی ہے نواب **اقتدار الملک** نے جو مرحمت   اُس نے کلفت کو سفر کی دل سے بالکل دھو دیا
یہ مقولہ ہند میں مدّت سے ہے ضرب المثل   جو کہ جا پہنچا دکن میں بس وہیں کا ہو رہا
ہے دکن کی وہ یہی شاید مسافر پروری   جو دکن میں آکے دیتی ہے وطن دل سے بھلا
وارثِ ملکِ دکن ہے آج وہ محبوبِ خلق   نام پر دیتا ہے جس کے جان ہر چھوٹا بڑا
ہم کہ ہیں وکٹوریا کے عہدِ رافت میں پلے   امن و آزادی کی ہم نے کھائی ہے برسوں ہوا
جانتے ہیں ہم کہ ملتی ہے رعیّت کس طرح   کس طرح ہوتے ہیں مقبولِ جہاں فرماں روا
کرتے ہیں کس منتر اور افسوں سے تسخیرِ قلوب   کس طرح بوتے ہیں دل میں خلق کے تخمِ وفا
کر لیا محکوم کے دل میں اگر حاکم نے گھر   تو یہ سمجھو حق حکومت کا کیا اُس نے ادا
ہے یہی شاہِ دکن کی گلّہ بانی کی دلیل   گلّہ اپنے گلہ باں پر جان و دل سے ہے فدا
پوچھنے گچھنے کی اہلِ ملک سے حاجت نہیں   اُن کی خوشحالی پہ انکی تازہ روئی ہے گوا
دیکھتے آئے تھے جیسے راہ میں ہم سبزہ زار   خلق کو سرسبز دیکھا آکے یاں اِن سے سوا

راہ میں دیکھے تھے ہمنے کوہ اگر گردوں شکوہ
آ کے دارالملک میں دیکھے محل گردوں نما[1]
عالموں کی سخت گیری سے ہیں سب آزادیاں
بے نوا سے منعم اور منعم سے بڑھ کر بے نوا
اغنیا میں ہم وہ استغنا نہیں پاتے کہیں
جیسا بے پروا نظر آتا ہے یاں ایک ایک گدا
جتنی یاں قومیں ہیں سب رکھتی ہیں باہم میل جول
بے تعصّب بے تکلّف بے تصنّع بے ریا
ایک کے تہوار میں بے عذر ہیں سارے شریک
ایک کی تقریب میں ہمدم ہیں سب اور ہمنوا
دولتِ عالی نے حق سب کو برابر ہیں دیے
ایک پر ترجیح کچھ رکھتا نہیں یاں دوسرا
پارسی۔ ہندو۔ مسلماں یا مسیحی کوئی ہو
ہے دکن کو ہر کوئی اپنی ولایت جانتا
ہمکو یاں کہنا تھا کچھ اور کہہ گئے بھولے سے کچھ
رہ گذر کی سیر نے منزل سے غافل کر دیا
قصّہ کوتہ۔ بار جب ہم کو ملا دربار میں ÷
کہہ نہیں سکتے کہ بیداری تھی وہ یا خواب تھا
دیکھ کر اپنی رسائی تختِ آصف جاہ تک
واقعہ مور اور سلیماں کا ہمیں یاد آگیا
حضرتِ والا نے جس شفقت سے کیں نذریں قبول
اِس پہ گر جاں اپنی ہم قرباں کریں تو ہے بجا
جس توجہ سے سُنی روداد قومی درس گاہ
شکر سے اُسکے نہیں ہو سکتے ہم عہدہ برآ
جب سے کالج کی علی گڑھ میں بنا ڈالی گئی
دولت عالی مدد کرتی رہی اُس کی سدا
جو لگایا تھا درخت اُس کی ہمیشہ لی خبر
دمبدم پانی دیا یاں تک کہ بار آور ہوا
اب۔ کہ وقت آکر پڑا تھا بانیِ کالج پہ سخت
دولتِ عالی نے شرط دستگیری کی ادا
مشکلیں جس طرح کی تھیں قوم کی اوّل بحل
کی اُسی دریا دلی سے اُنکی پھر حاجت روا
خود علی گڑھ کالج اور اُسکے در و دیوار سب
راگ گائیں گے سدا احسانِ آصف جاہ کا

---

[1] یہ اشارہ ہے اُس محل کی طرف جو کہ نواب وقارالامرا بہادر نے بلدہ حیدرآباد کے باہر جنوب کی پہاڑ پر زرِ خطیر صرف کر کے اپنے رہنے کے لیے بنوایا ہے اور اُس کا نام فلک نما رکھا ہے - ۱۲

ہند میں باقی ہیں نسلیں جب تلک اسلام کی   جیتے جی ہونگی نہ اسکے طوقِ منت سے رہا
کی ہی سرسید نے جو کوشش فلاحِ قوم میں   اُس کو ہے اے اہلِ مجلس اِک زمانہ جانتا
پر یہ سرسید سے بیڑا پار ہونا تھا محال   دولتِ عالی اگر بنتی نہ اُس کی ناخدا
تھا بڑا سید کا سچ پوچھو تو خشکی میں جہاز   دولتِ عالی نے اس خشکی میں گنگا دی بہا
ہے روایت۔ جبکہ ہجرت کرکے ختم المرسلیںؐ   پہنچے یثرب میں تو یہ ارشاد یاروں سے کیا
"جس طرح ہوتی ہی بانبی[1] سانپ کی جائے پناہ   ہوگا ملجا اب مدینہ بھی یونہی اِسلام کا"
ہے بلا تشبیہ۔ دارالملک آصف جاہ بھی   ہند میں اب مرکزِ اسلام ہے بے رو و ریا
ذی لیاقت جتنے تھے ہندوستاں میں انتخاب   دولتِ عالی نے چُن چُن کر لیا سب کو بُلا
تربیتیں اور خانقاہیں۔ مدرسے اور مسجدیں   سب کی ہوتی ہی مدد اِس گھر سے بے چون و چرا
حج بیت اللہ سے جو ہر مسلماں پر ہے فرض   ہی دکن آنا مقدم۔ شک نہیں اِس میں ذرا
اوّل آنا چاہیئے یاں استطاعت کے لیے   کیونکہ ہے بے استطاعت حج کو جانا۔ ناروا
خرچ سے ہاتھ اِک مسلماں کا ہوا اگر اُتر میں تنگ   ہے دکن کی سمت وہ گردن اُٹھا کر دیکھتا
خواب آتے ہیں دکن کے اُسکو سوتے میں نظر   قوم کا بچہ مڈل سے جب ذرا آگے بڑھا
ہند میں کرتے ہیں کوشش جو رفاہِ خلق میں   اور مدد کو جن کی واں حاضر ہے ہر چھوٹا بڑا
چلتے چلتے اُنکی گاڑی بھی اٹک جاتی ہی جب   کھینچنے کو اُسکے جاتا ہے یہیں سے بینڈیا[2]
ہے دکن کی اور مسلمانوں کی یاد وہ مثال   اِک سمندر ہے کہ ہر سو جس میں ہی طوفاں بپا
تھا جہاز اک اسمیں معمور اہلِ فضل و جاہ سے   لطمۂ امواج نے پرزے دیے اُس کے اُڑا

---

[1] باں بی = سانپ کا گھر۔ [2] جب گاڑی یا چھکڑا بیلوں سے نہیں کھچ سکتا تو بیلوں کی جوڑی کے آگے تیسرا بیل لگا دیتے ہیں اُس کو بینڈیا کہتے ہیں - ۱۲

ڈوبنے والے تھے جو وہ ڈوب کر اُچھلے نہ پھر / بچ رہے ہیں جو وہ ہر سو مارتے ہیں دست و پا
کوئی کشتی یا جہاز آتا نہیں اُن کو نظر / اِس محیط بیکراں میں ایک زورق[1] کے سوا
ہے وہ زورق فی المثل سرکار آصف جاہ کی / ہے مسلمانوں کو اب لے دے کے جس کا آسرا
ہے دعا جس وقت تک پانی سمندر میں رہے / یا رب اِس زورق کو تو موجِ حوادث سے بچا
ختم کر حالی سپاسِ صدرِ اعظم پر سخن / بال بال اپنا ہے جس کے شکر میں جکڑا ہوا
تقویت سے جسکی ہر مشکل ہماری حل ہوئی / انجمن کے منعقد ہونے کی دی جس نے رضا
پھر ادا کر جان و دل سے شکر صدرِ انجمن / جسکے قدموں میں یہ زیبا ہے کہ دیں آنکھیں بچھا
جس نے قومی انجمن میں بن کے صدرِ انجمن / قوم کو دی عزت اور اُنکی اُمیدیں بڑھا
لیکے اذنِ صدرِ مجلس کیجیے پھر قصدِ وطن / ورنہ ہے حالی دکن کی دلفریب آب و ہوا
باندھیے جلد اب رختِ سفر۔ ڈر ہے کہ ساتھ / قافلہ سے چھٹ نہ جائے قافلہ سالار کا

۱۱۔ قطعہ[2] مرتبہ سنہ ۱۳۰۹ھ

بمقام حیدرآباد دکن

ہاں بلا کر دی ہے جو عزت ہمیں سرکار نے / اوّل اُس کا شکر کرتے ہیں ادا اور بعد ازیں

---

[1] ہلکی کشتی۔ ۱۲

[2] سنہ ۱۳۰۹ھ میں جو راقم اور مولانا شبلی نعمانی اور دیگر بزرگان قوم آنریبل ڈاکٹر سر سید احمد خاں بہادر کے ہمراہ علی گڑھ محمڈن کالج کی طرف سے بطور ڈیپوٹیشن کے حیدرآباد دکن میں بحضور سرکار عالی نظام حاضر ہوئے تھے۔ اس موقع پر ایک عام جلسہ بصدارت نواب وقار الامرا بہادر بشیر الملک میں منعقد ہوا تھا جس میں راقم اور مولانا محمد شبلی اور بعض اور صاحبوں نے کچھ نظمیں سرکار عالی کے شکریہ میں پڑھی تھیں جلسہ کے بعد جناب صدر انجمن نے مجکو اور مولانا محمد شبلی کو خاص طور پر ہماری نظمیں دوبارہ سننے کے لیے دولت خانہ پر طلب فرمایا تھا وہاں اپنی نظم پڑھنے سے پہلے یہ قطعہ جو اُسیوقت موزوں کیا گیا تھا راقم نے پڑھا تھا ۱۲

خدمتِ والا میں ہیں اِک عرض کرنی چاہتے
غرض کرنے کی اجازت ہو اگر اپنے تئیں
شاعری جس کو سمجھتے ہیں کمال ابنائے دہر
جو لیاقت اسمیں ہی درکار وہ ہم میں نہیں
شکر کرنا تھا ہمیں سرکار عالی کا ضرور
چند نظمیں انجمن میں اس لیے ہمنے پڑھیں
گرچہ کی ہی کوشش ان نظموں کے لکھنے میں بہت
اور جگہ انگشت رکھنے کی نہیں چھوڑی کہیں
رہ گیا پر ہم سے اس کوشش میں باقی اِک قصور
در گذر فرمائینگے سرکار اس سے ہے یقیں
اور تو کچھ خوبیاں شاید ملیں ان میں۔ مگر
جھوٹ جو اشعار کا زیور ہی وہ ان میں نہیں

۱۲۔ قطعہ مرتبہ ؁۱۳۰۹ھ بمقام حیدر آباد

در شکر اضافہ وظیفہ بہ پیشگاہ جناب نواب سر آسمان جاہ بہادر

اے بشیرِ دولت و دیں نائبِ شاہِ دکن
اے مہاتِ دکن کا ذات پر تیری مدار
مجھ پہ فرمایا ہے جو لطف و کرم سرکار نے
شکر اُس کا کر نہیں سکتا ادا میں زینہار
جو کہ ہوتے ہیں جہاں میں بہرہ ور مقصود سے
پہلے ہو لیتے ہیں صدہا مشکلوں سے دوچار
کوئی دُنیا میں نہیں ہوتی بغیر اس کے فتوح
ہے اِسی پر کامیابی کا زمانے کی مدار
پر ملا مقصود جب حالی کو اس در سے ملا
بے تردّد بے تذلل بے طلب۔ بے انتظار
قدردانی گر زمانہ میں یونہیں ہو جائے عام
پائیں بے مانگے مُرادیں اپنی سب اُمیدوار
یارب اِس سرکار کو۔ ہی جس سے عالم فیضیاب
جب تلک دنیا ہے دنیا میں رکھیو برقرار

۱۳۔ ترکیب بند مرتبہ سنہ ۱۸۹۱ء مطابق سنہ ۱۳۰۹ء

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے چھٹے اجلاس میں بمقام علی گڑھ پڑھا گیا

شکر[لہ] اس نعمت کا یا رب کر سکے کیونکر زباں
تو نے رکھا ہم کو یاں فقر و غنا کے درمیاں
جب ہوئے بھوکے تو بخشی تو نے نان و نانخورش
پر نہ اتنی۔ معدہ و احشا[ٹہ] پہ جو گزرے گراں
جب ہوئے پیاسے تو بخشا آبِ شیریں اور خنک
پر نہ ایسا۔ ہو صراحی جسکی یاروں سے نہاں
ڈھانکنا چاہا بدن جب تو دیا تو نے لباس
پر نہ ایسا جسکو حسرت سے تکیں خورد و کلاں
کھانے پینے کو کیے برتن ہمیں تو نے عطا
پر نہ ایسے۔ ٹوٹنے سے جنکے ہو خوفِ زیاں
سونے اور آرام کرنے کو دیا بستر ہمیں
پر نہ ایسا جس سے اُٹھنا ہو طبیعت کو گراں
رہنے سہنے کو دیئے گھر تو نے ہم کو ہر جگہ
پر نہ ایسے۔ ہو تعلّق جن سے مثلِ جسم و جاں
آنے جانے کو دیے دو پانویاں تو نے ہمیں
جن سے ڈر کے بھاگنے کا اور نہ گرنے کا گماں
راہ اور بے راہ یکساں جن کو ہنگامِ خرام
کوہ سدِّ راہ جن کا اور نہ خندق اور کنواں

[لہ] اس نظم میں متوسط درجہ کے لوگوں کی حالت کو فقرا اور اغنیا دونوں کی حالت سے بہتر بتایا گیا ہے۔ متوسطین سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے اپنی ذاتی کوشش اور سلفِ ہلپ سے دولت عزت نیکنامی یا علم و فضل میں اپنی پہلی حالت سے ترقی کر کے اپنے ہمسروں میں امتیاز حاصل کیا ہو۔ ادنیٰ درجہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی پست حالت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتے یا چاہتے ہیں مگر نہیں بڑھ سکتے۔ اعلیٰ درجہ سے وہ لوگ مراد ہیں جو دولت عزت کے لحاظ سے ایک ممتاز حالت میں پیدا ہوئے مگر اس حالت سے ترقی کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے اور نیز اُس حالت پر قایم رہنے کی فکر اور اس سے تنزل کرنے کا کچھ انسداد نہیں کرتے۔ ۱۲ حالی

[ٹہ] آنتیں۔ ۱۲

کی سواری بھی عطا اکثر جو پیش آیا سفر
پر نہ ایسی۔ تخت فرعونی کا ہو جس پر گماں

سیم و زر وقتِ ضرورت ہمکو تو دیتا رہا
پر نہ اتنا۔ ہو نگہبانی میں جس کی بیم جاں

آبرو تو نے ہمیں دنیا میں دی اور امتیاز
پر نہ ایسی جس سے ہوں محسودِ ابنائے زماں

نعمتیں اکثر ہمیں بعد از مشقت تو نے دیں
تا کہ تیری نعمتوں کی قدر ہو ہم پر عیاں

راحتیں اکثر میسر آئیں تکلیفوں کے بعد
تا کہ کھو بیٹھیں نہ ہم ان راحتوں کو رائگاں

وقت پر کرتا رہا بارانِ رحمت سے نہال
قحط اور طوفان دونوں سے بچایا بال بال

الحذر اُس فقر و ناداری سے سو بار الحذر
لومڑی جاتے ہیں بن جسکی بدولت شیر نر

چاپلوسی جا کے کرتے ہیں سفیہوں کی فقیہ
ناکسوں کے ناز بیجا سہتے ہیں اہلِ ہنر

وزن میں علم و فضیلت جنکے ہیں ہم سنگ کوہ
وہ سُبک تر دانۂ خردل سے آتے ہیں نظر

فقر و حاجت میں نہ ہو انسان کو جب صبر و شکیب
پھر نہیں کوئی بُرائی فقر و حاجت سے بتر

بھیک منگوائے جو اکھلوائے یہ چوری کرائے
پت گنوائے آبرو کھوئے پھرائے دربدر

ہو سکے محتاج سے طاعت نہ یاد اللہ کی
لے سکے محتاج جورو کی نہ بچوں کی خبر

گہ زباں آلودہ اُس کی شکوۂ تقدیر سے
اور کبھی بوچھار اُس کی آسمانِ پیر پر

گہ بخیلوں کی مذمت پر کبھی آجائے وہ
ہو نہ سب و ستم سے سیری اُسے دو دو پہر

اُگلے زہر اتنا کہ ہو جائے مذاقِ بزم تلخ
کھول دے غیبت کا دفتر اہلِ دولت کی اگر

گہ وبائے عام کی مانگے دعا اللہ سے
تا کہ دولتمند بھی کچھ دن رہیں آسیمہ سر[1]

اور کبھی چاہے کہ ہو دنیا میں کوئی انقلاب
تا کہ ہو جائیں بلند اور پست سب زیر و زبر

---

[1] بدحواس پریشان حال ۔ ۱۲

بے حلاوت اُسکی دنیا اور مذبذب اُسکا دیں
خوفناک اُسکا ارادہ نیت اُس کی پُرخطر
رات اُسکی حسرت آگیں اور دن اندوہ گیں
شام اُس کی پُرنحوست اور شوم اُس کی سحر
گو کہ بدتر فقر سے یارب نہ تھی کوئی بلا
تھا۔ مگر ثروت میں اس سے بھی زیادہ شور و شر

فقر سے تو نے بچایا یہ بھی کم نعمت نہیں
پر نہ دی ثروت سوا اسکے شکر کی طاقت نہیں

نشۂ دولت سے تھا پھر ہوش میں آنا محال
اِس مئے مردآزما کی تھی بہت مشکل سنبھال
نفس امارہ اور اُس پر چھیڑ مال و جاہ کی
ڈھیر ہے بارود کا دیجے پتنگا جس میں ڈال
بادِ صرصر آگ کو اس طرح بھڑکاتی نہیں
جس طرح جذبات نفسانی کو بھڑکاتا ہے مال
ہضم کرنا اور پچانا مال و دولت کا ہے بس
نفس انساں میں اگر بالفرض ہے کوئی کمال
ورنہ مال و جاہ و مکنت کا جہاں آیا قدم
اور ہوئے سلب آدمی سے آدمیت کے خصال
عقل ٹھیراتی ہے جو افعال انساں پر حرام
کر دیئے اُسکے لیے سب مال و دولت نے حلال
فقر میں تھا نفس دوں واماندہ جس پرواز سے
آگے ثروت نے دیے پر واسطے اُسکے نکال
خواہشیں یوں نفس میں اب دم بدم بڑھنے لگیں
مغز میں جس طرح دیوانہ کے گوناگوں خیال
آپ کو گننے لگا بالاتر از ابنائے جنس
چیونٹوں میں ایک نے گویا نکالے پر و بال
مسرف بے زر ہو جیسے قرضخواہوں میں گھرا
خواہشوں میں اس طرح جکڑا ہوا ہے بال بال
جھک پڑی طبع دنی گر بخل و خسّت کی طرف
ہو گئی فرزند و زن پر زندگی اسکی وبال
اور اگر بھوت اُسکے سر پر چڑھ گیا اسراف کا
پھر نہیں گنجینۂ قارون کچھ آگے اُسکے مال
آگیا غالب طبیعت پر گر استسقائے حرص
ہے سمندر سے بھی اسکی پیاس کا بجھنا محال
باڑ پر تلوار کی چلنا نہیں شاق اس قدر
جس قدر ثروت میں ہے دشوار پانا اعتدال

گلشنِ دولت کے ہوں انگور میٹھے بھی اگر
دیکھ اے روباہِ نفسِ دوں حذر اُن سے حذر

ہی عجب دنیا میں نعمت درمیانی زندگی
فقر کی ذلّت سی اور ثروت کے فتنہ سے بری

چین ہی دنیا میں گر کچھ تو اسی حالت میں ہی
یہ جو ہے برزخ میانِ مکنت و دستِ تہی

فقر و ثروت فی المثل ہوں دوزخ اور جنت اگر
مانگتے ہیں ہم حذر دوزخ سے اور جنت سے بھی

دخلِ شیطاں اُس کا ہو جس میں ایسی جنّت کو سلام
منزلِ اعراف سو بار ایسی جنت سے بھلی

اِس کٹھن منزل میں ہی بیٹھا ہی اِک بے خطر
ہی اِدھر گھڈا اور چڑھائی ہی اُدھر البرز کی

رہتے ہیں فقر و غنا میں جو کہ حالت بَین بَین
ہیں حسد اور کبر کے امراضِ مہلک سے بری

اپنے سے اعلیٰ کی حالت پہ اگر آتا ہے رشک
دیکھ کر ادنیٰ کو کر لیتے ہیں اپنی دلدہی

سنکے ہو جاتے ہیں سیدھے نہ دیرینہ کا فخر و ناز
ملکے چھوٹوں سے بہک جاتا ہے گر غنا کبھی

لذّتِ فقر و غنا دونوں سے ہیں وہ آشنا
اغنیا میں ہیں فقیر اور ہیں فقیروں میں غنی

جو گذرتی ہے گدا پر اُس سے ہیں وہ باخبر
کیونکہ حالت گاہ گاہ ان پر بھی گذری ہی یہی

امتحاں دولت کے بھی ہیں کچھ نہ کچھ جھیلے ہوئے
کیونکہ ہی ہر گھونٹ میں اس مے کے بدمستی وہی

اِس لیے جب دیکھتے ہیں عُسرتِ ابنائے جنس
جوشِ ہمدردی سے بیکل اُن کا ہو جاتا ہی جی

اور نہیں کرتے زبانِ طعن بے دردی سے وا
جب کہ سُنتے ہیں کسی منعم کی از خود رفتگی

مست کی بے اختیاری تشنگی مخمور کی
واردات ایک ایک کی ہی سر بسر اُن پر کھُلی

جنت اور دوزخ ہے سب اعرافیوں پر جلوہ گر
گندم اور زقّوم دونوں ان کے ہیں پیشِ نظر

دل توانا ور قوی یاروں کی ہمت اُن سے ہی
منتظم ہر قوم و ملّت کی جماعت اُن سے ہی

مشکلیں اکثر انھیں سے قوم کی ہوتی ہیں حل
بھائیوں کے بازو دینمیں زور طاقت ان سے ہے
ہیں انھیں کے دم سے جو ہے گرمیٔ ہنگامہ آج
ساری قومی مجلسونکی زیب و زینت ان سے ہے
ہیں جہاں دولت یہی ہیں نظم دولت کے کفیل
ملک کی دولت ہیں یہ جو خیر و برکت ان سے ہے
ہاتھ میں انکے ہیں جتنے عقل و دانش کے ہیں کام
عقل و دانش میں ہیں جن ملکونکی شہرت ان سے ہے
ہیں گداؤں کے وسیلے اور شاہوں کے مشیر
شاہ ہوں یا ہوں گدا دونوں کو قوت ان سے ہے
آدمیت سیکھتے ہیں ان سے سب چھوٹے بڑے
نوعِ انساں میں بقائے آدمیت ان سے ہے
یہ نہ ہوں تو علم کی پوچھے نہ کوئی بات یاں
رونقِ بازارِ جنسِ علم و حکمت ان سے ہے
پاؤ گے انہیں طبیب انہیں ادیب ان میں خطیب
ہے اگر انسان کو حیواں پر فضیلت ان سے ہے
پاؤ گے ان میں مہندس پاؤ گے ان میں حکیم
آدمی مصداق رحمانی خلافت ان سے ہے
کرتے ہیں اخلاق ادنیٰ اور اعلیٰ ان سے اخذ
آدمی سب ہیں مگر انساں عبارت ان سے ہے
انہیں قوموں کے ہیں مصلح انہیں ملکونکے وکیل
آبرو قوموں کی اور ملکونکی عزت ان سے ہے
پھونکتے ہیں روحِ قومیت یہی افراد میں
ہے جہاں قومونمیں یکرنگی و وحدت ان سے ہے

دم سے ہے وابستہ ان کے قوم کا سارا نظام
یہ اگر بگڑے تو سمجھو قوم کا بگڑا قوام

گر نہ ہو ہر حال میں ان کی مصالح پر نظر
ہیں مفاسد گرد و پیش اُن کے فراہم سر بسر
کھیلتی ہے جس طرح بتیس دانتوں میں زباں
ہے انھیں بھی شہر سے یاں بچ بچ کے رہنا عمر بھر
گھاٹیاں فقر و غنا کی انکے ہیں دونو طرف
اور رستہ بیچ میں ہے بال سے باریک تر
ایک جانب پستیٔ فطرت ہے اور دوں ہمتی
ایک جانب مستی و غفلت ہے اور کبر و بطر
جھک پڑے گر اس طرف تو مفت کھو بیٹھے
وہ جو اڑنے کیلیے حق نے دیے تھے بال و پر

ڈھل گئے گر اس طرف تو اس بلا میں پھنس گئے
جس میں پھنس جاتی ہے مکھی شہد میٹھا جان کر
برکتیں اللہ کی اُس قوم پر جس قوم میں
وہ سپر یہ طبقۂ والا ہو سیدھی راہ پر
ہیں معطل اغنیا اور بے نوا کوتاہ دست
سب کی پڑتی ہے اُنھیں کے دست و بازو پر نظر
جو قوائے انکو ملے ہیں کام میں لائیں اُنھیں
تاکہ زندوں کی طرح ہو زندگی ان کی بسر
فرض ہیں جو انکے ذمے خالق اور مخلوق کے
اُنمیں سرگرداں رہیں دیوانہ وار آٹھوں پہر
قوم ہو گر ناتواں تو تقویت بخشیں اُسے
کیونکہ اُسکے ضعف سے ہے ان کی قوت کو ضرر
گو نجات انساں کو مکروہات دنیا سے نہیں
جن سے بچنا گوشت سے ناخن چھٹانا ہے مگر
کام دنیا میں سنوارے ہیں جنھوں نے قوم کے
تھے نکموں سے وہ مکروہات میں آلودہ تر
سارے بھگتاتے تھے بائیں ہاتھ سے دنیا کے کام
اور دائیں سے مہمیں قوم کی کرتے تھے سر

جس طرح اس انجمن کے رُکن آئے ہیں تمام
قوم کی خاطر ہزاروں چھوڑ کر دنیا کے کام

قوم کو ہے آس جس کی وہ جماعت ہے یہی
جس سے جان آتی ہے مُردوں میں وہ طاقت ہے یہی
اتفاق قوم ہے اقبال و دولت کی دلیل
رائی کو کرتی ہے جو پربت وہ قوت ہے یہی
مال و دولت نامبارک ہے نہ ہو گر اتفاق
قوم جس دولت کی بھوکی ہے وہ دولت ہے یہی
یاں وکیل ایک اک ہے شہر اور ملک کا قائم مقام
دانہ کو کرتی ہے جو خرمن وہ برکت ہے یہی
رائگاں جائیگا یاروں کا نہ یہ رنج سفر
راحتیں جسکی طفیلی ہیں وہ زحمت ہے یہی
فرد فرد آتے ہیں جو جاتے ہیں یاں سے مجتمع
ملتے ہیں جسکی بدولت دل وہ ملت ہے یہی
تم ہمارے کام آؤ ہم تمھارے آئیں کام
جس سے کل چلتی ہے دنیا کی وہ حرکت ہے یہی
قوم کی خدمت میں مضمر ہے ربوبیت کی شان
جو کہ پُجواتی ہے خادم کو وہ خدمت ہے یہی

قوم کی ذلّت کو سمجھیں ذلّت اپنی سب عزیز ملک میں عزّت سے اب رہنے کی صورت ہے یہی
سال بھر رہتا ہے نقش اس انجمن کا یادگار جو کبھی برہم نہیں ہوتی وہ صحبت ہے یہی
کر رہا ہے قوم کے سرکل[1] کو یہ مجمع وسیع جزر سے افزوں ہے مدّ جس کا وہ رفعت ہے یہی
اتفاقاً گر کبھی ہو جائے یہ ہنگامہ سرد ڈر نہیں اس کا کہ خود قانونِ قدرت ہے یہی
ہے کبھی افراطِ باراں اور کبھی ہے قحطِ آب طینتِ عالم میں خاصیت ودیعت ہے یہی
کال ہے گر اس برس تو ہے سماں اگلے برس جو خبر دیتی ہے کثرت کی وہ قلّت ہے یہی
دیگ تو پکتے ہی پکے گی دھیمی آنچ میں کچھ اُبال آیا تو ہے اس میں غنیمت ہے یہی

انجمن ہے قوم کی ہنگامۂ شادی نہیں
ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

۱۴۔ مسدّس مرثیہ سنہ ۱۳۱۰ھ

مرثیہ جناب حکیم محمود خاں مرحوم دہلوی

اے جہان آباد اے اسلام کے دار العلوم اے کہ تھی علم و ہنر کی تیرے اک عالم میں دھوم
تھے ہنرور تجھ میں اتنے۔ جتنے گردوں پر نجوم تھا اضافہ تیرا جاری ہند سے تا شام و روم
زیب دیتا تھا لقب تجکو جہان آباد کا
نام روشن تجھ سے تھا غرناطہ و بغداد کا

تیری طینت میں ودیعت تھا مذاقِ علمِ دیں جیسے امّی تجھ میں تھے عالم نہ تھے ایسے کہیں
ہند میں جو تھا محدث تھا وہ تیرا خوشہ چیں تھی محدّث خیز اے پایتخت تیری سرزمیں

---

[1] سرکل (انگریزی) = دائرہ ۱۲

تھا تفقّہ بھی مسلّم تیری خاکِ پاک کا
بیہقیِ وقت تھا ایک اِک فقیہ اِس خاک کا
شاذ و نادر تھا تصوّف میں کوئی تیرا نظیر
آب و گِل کا تیرے تھا گویا تصوّف سے خمیر
تیرے کھنڈروں میں پڑے سوتے ہیں وہ مہرِ منیر
تھا کبھی انوار سے جن کے زمانہ مستنیر
آج جس دولت کا بازارِ جہاں میں کال ہے
تیرا قبرستان اِس دولت سے مالا مال ہے
طب میں گو یونانیوں کا سب سے آگے تھا قدم
آن کر اُس نے لیا تھا دوسرا تجھ میں جنم
جب کہ تو آباد تھا دُنیا میں اے باغِ ارم
بھرتے تھے تیرے اطبّا بھی مسیحائی کا دم
ہند میں جاری تجھی سے طبِّ یونانی ہوئی
شہر شہر اس جنس کی یاں تجھ سے ارزانی ہوئی
خاک سے اُٹھتے ہیں تیری جیسے جیسے نکتہ ور
اِک جہاں شیوہ بیانی سے ہے اُن کی باخبر
راس تھی آب و ہوا تیری سخن کو جس قدر
سبزہ کو ہوگی نہ راس اتنی ہوائے غاتفر[1]
حُسنِ صورت میں اگر ضرب المثل نوشاد[2] تھا
حُسنِ معنی تیرا حصّہ اے جہان آباد تھا
لیکے ساتھ اسلام نکلا تھا عرب سے جو علوم
جن میں تھی اسلامیوں کی چار سو عالم میں دھوم
دولت و اقبال کا جب تک رہا تجھ پر ہجوم
کھیتوں پر تیری اَبر آتے تھے اُمڈ کے جھوم جھوم

---

[1] سمرقند کے قریب ایک قطعہ زمین ہے یہاں کا سبزہ خوبی و زیبائی و راستی میں ضرب المثل ہے - ۱۲

[2] نوشاد اور خلخ دو شہر قدیم ترکستان میں تھے جو حُسن خیزی میں مشہور تھے - ۱۲

آئی گلشن میں نہ تیرے بھول کر فصلِ خزاں
تیری ہر حد میں رہا ہر علم و دانش کا سماں

جس طرح تھا فضل و دانش میں ترا مشہور نام   تھے تمدن میں بھی پیرو تیرے جمہورِ انام
آدمیت سیکھنے آتے تھے تجھ سے خاص و عام   شہری و بدوی تری تقلید کرتے تھے مدام

رسم میں آئین میں اوضاع میں اطوار میں
طرز میں انداز میں رفتار میں گفتار میں

رہ گیا باہر سے آکر جو کہ تجھ میں چند سال   ڈھل گئے سانچے میں گویا اسکے عادات اور خصال
آکے بن جاتا تھا یاں نقصان انسان کا کمال   تیرے پرچھاویں سے موتی بن کے جاتے تھے سفال

آتے ہی انسان کی کایا پلٹ جاتی تھی یاں
چار دن میں اور ہی صورت نکل آتی تھی یاں

تیرا معمورہ تھا اک عالم میں مرجع اور مآب   آن کر لیتے تھے یاں ٹھیکی جہاں کے انتخاب
بستے تھے اطراف سے آ آکے تجھ میں شیخ و شاب   کر دیا تھا تیری آبادی نے ملکوں کو خراب

جمگھٹا تھا تجھ میں ترک و فرنگ و روم و زنگ کا
دستہ تھا گویا کہ تو گلہائے رنگا رنگ کا

لیکن آخر طبعِ دوراں کا ہے جیسے اقتضا   ہر ترقی کی ہے حد ہر ابتدا کی انتہا
جب کہ دورہ اپنا تو دنیا میں پورا کر چکا   وقت اے جانِ جہاں تیرا بھی آخر آ لگا

گردشِ افلاک کے ہونے لگے تجھ پر بھی وار
تیرے گلشن سے بھی کوچ آخر لگی کرنے بہار

تجھ پہ اے دار الخلافت انقلاب آنے لگے   غیب سے تجھ کو تباہی کے خطاب آنے لگے

طالعِ مشفق کے پیغامِ عتاب آنے لگے   تیرہ بختی کے نظر یاروں کو خواب آنے لگے
دولت و اقبال کا بندھنے لگا رختِ سفر
تجھ سے اے دار العلوم اُٹھنے لگا علم و ہُنر
ہو گئے تیرے محدّث راہیِ دار السلام   کر گئے دنیا سے رحلت تیرے مفتی اور امام
ہو گیا رخصت جہاں سے تیرا جاہ و احتشام   رفتہ رفتہ ہو گئی سب صاحبی تیری تمام
مجلسیں برہم ہوئیں زیر و زبر دیواں ہوئے
خانقاہیں بے چراغ اور مدرسے ویراں ہوئے
چل دیے نوبت بہ نوبت تیرے شاعر اور ادیب   مٹ گئی تیری طبابت چھٹ گئے تیرے طبیب
جاگ جاگ آخر سدا کو سو گئے تیرے نصیب   اس گلستاں سے نہ اُٹھی پھر صدائے عندلیب
جن کو کھو بیٹھے نظیر اُن کا کہیں پایا نہ پھر
جو گیا۔ اُس کا کوئی قائم مقام آیا نہ پھر
کر گئے اخلاق اور آداب سب تجھ سے سفر   گر گیا نظروں سے تیرا سب جلال و جاہ و فر
جھڑ گئے تاجِ شرف سے تیرے سب لعل و گہر   تجھکو اے دار الخلافت کھا گئی کس کی نظر
علم ہے باقی نہ اب دولت ہی تیرے پاس وہ
اے گلِ پژمردہ تیری کیا ہوئی بو باس وہ
دورِ آخر میں کہ تیرا تیل تھا سب جل چکا   بجھتے بجھتے تھا کچھ اک تو نے سنبھالا سا لیا
خاک نے یاں تیری پھر اُگلے وہ لعلِ بے بہا   جن سے روشن ہو گیا کچھ دن کو نام اسلاف کا
عہدِ ماضی کا سماں آنکھوں میں سب کی چھا گیا
خواب جو بھولا ہوا مدت کا تھا یاد آ گیا

جاہ و مکنت قوم کی گو تجھ میں کچھ باقی نہ تھی   پر نہ کی عرضِ ہنر میں تو نے اب بھی کوتہی
اس بزرگی سے گذاری تیرھویں تو نے صدی   پھر گئی آنکھوں میں پھر تصویر دورِ اکبری
علم و دین و شعر و حکمت طبّ و تاریخ و نجوم
ڈال دی پھر اپنی تو نے چار سو ہر فن میں دھوم

ملک میں ہر سو وہی پھر بول بالا تھا ترا   تھا جہاں علم و ہنر گو دوں کا پالا تھا ترا
تھی جہاں کچھ روشنی وہ سب اُجالا تھا ترا   پھر جو دیکھا غور سے وہ اک سنبھالا تھا ترا
چاند نکلا تھا گہن سے جو وہ پھر گہنا گیا
چار دن کی چاندنی تھی پھر اندھیرا چھا گیا

علم والے علم کے دریا بہا کر چل بسے   واعظانِ قوم سوتوں کو جگا کر چل بسے
کچھ سخنور تھے کہ سحر اپنا دکھا کر چل بسے   کچھ مسیحا تھے کہ مُردوں کو جلا کر چل بسے
ایک تختہ رہ گیا تھا تیری ٹوٹی ناؤ کا
لے گئی سیلِ فنا اس کو بھی اے دِلّی بہا

جا چکی تھی تجھ سے گو اے شہر عظمت قوم کی   ہو چکی تھی آبرو و دولت سے رخصت قوم کی
پر کچھ اک محمود خاں کے دم سے تھی پت قوم کی   اُٹھ گیا وہ بھی جہاں سے آہ قسمت قوم کی
کیا دکھا کر اب دِلائے گا سلف کو یاد تو
ناز اب کس پر کرے گا اے جہان آباد تو

تجھ میں ہی دِلّی کوئی اب ایسا مقبولِ جہاں؟   نازشِ دار الخلافت مرجعِ ہندوستاں
ہند سے لے تا عرب کشمیر سے تا اندماں   بچّہ بچّہ کی زباں پر نام ہے جس کا رواں

نیم جانوں کا مسیحا اور غریبوں کا طبیب
خود حکیموں کا معالج اور طبیبوں کا طبیب

ہے کوئی اب تجھ میں ہیرو ایسا یکتائے زماں   واقعاتِ زندگی کر دیجیے گر اُس کے بیاں
سمجھیں اِک افسانہ ناواقف اُسے اور داستاں   ہے تعجب خیز الحق سیرتِ محمود خاں
یا وہ اِک جوہر الگ تھا جوہرِ انسان سے
یا نکلتے اب نہیں ایسے جواہر کان سے

اُس کا تھا دیوان خانہ ملک کا دارالشفا   خلق کا دن رات رہتا تھا جہاں تانتا بندھا
مفت بیماروں کو اُس کے در سے ملتی تھی دوا   فکر نذرانہ کا تھا اُن[1] کو نہ شکرانہ کا تھا
اُس کے استغنا سے جھک جاتا تھا سر مغرور کا
اور عنایت سے کنول جاتا تھا کِھل مزدور کا

بے حقیقت اُس نے سمجھا مال و دولت کو سدا   تھے برابر اُس کے نزدیک اغنیا اور بینوا
گو طبیب اور ڈاکٹر تھے شہر میں بے انتہا   کوئی مفلس کا نہ تھا پرسانِ حال اُس کے سوا
کرتے ہیں جو دعوئِ ہمدردیِ نوعِ بشر
اُس نے باطل کر دیے تھے اُنکے دعوے سر بسر

طبِ مسلمانوں کی لی اُس کی مسیحائی نے تھام   ورنہ اب تک اُس کی ترکی ہو چکی ہوتی تمام
رونقِ طبِ جدید اور اُس پہ میل خاص و عام   درسگاہوں اور دوا خانوں کا اُسکے انتظام
دیکھ کر تھا اک زمانہ اُس کی خوبی کا مقر
طبِ یونانی گئی تھی خلق کی نظروں سے گر

---

[1] یعنی بیماروں کو ۱۲

سرجنوں کے دیکھ دیکھ آلات و اعمال و حیل[لہ]   آ گیا تھا رائے میں زود اعتقادوں کی خلل
دیں مگر اسکی مسیحائی نے سب آئیں بدل   طب یونانی گئی کچھ دن کو پھر گر کر سنبھل
سلطنت اور عقل تھی جس فوج کی ہمت فزا
ایک طاقت اسکے حملوں سے ہوئی عہدہ برآ

گو کہ جاتے تھے شفاخانوں میں خاص و عام سب   پر الجھ جاتے تھے سخت امراض میں بیمار جب
خلق کا پھر ملجا و ماویٰ اسی کا تھا مطب   اسکے بیماروں کو۔ گو مایوس ہوں یا جاں بلب
سوء تدبیر و معالج کی خطا کا ڈر نہ تھا
موت کا ڈر تھا مگر مہلک دوا کا ڈر نہ تھا

رکھتے ہیں آلات پر سرجن بھروسا جس قدر   کرتے ہیں معلوم جو جو ان سے امراض بشر
وہ بتا دیتا تھا سب کچھ رکھ کے انگلی نبض پر   اس کی اک انگلی پہ تھے قرباں سو تھرما میٹر
نارسا تھیں دوربینیں اہل صنعت کی جہاں
جا پہنچتی تھی نگاہ دوربیں اس کی وہاں

شہر کے سب مرد و زن۔ پیر و جواں خرد و کلاں   تھے قوی پشت اس سے ایسے جیسے پشتہ سے مکاں
جس کو نسخہ دیدیا لکھ کر وہ یہ سمجھا کہ ہاں   زندگانی کے ابھی کچھ اور دن باقی ہیں یاں
گو کہ ماتم ملک میں ہے اس کا ہر سو آج کل
پر۔ گئی اے شہر تیری جان ہی گویا نکل

کیا عجب پیدا ہوں پھر ایسے طبیب و چارہ گر   جو کہ تشخیص مرض میں رکھتے ہوں غائر نظر
خلق کو تکیہ ہو جن کی رائے اور تدبیر پر   شہر میں ہوں مرجع کل۔ ملک میں ہوں نامور

[لہ] حیلہ کی جمع، ترکیبیں - ۱۲

جمع ہوں محمود خاں کی ذات میں اتنے کمال
ہے یہ سب ممکن۔ مگر محمود خاں ملنا محال

راستی اور راستبازی اس کی تھی ضرب المثل   اُسکے کاموں میں ریا تھی اور نہ باتوں میں دغل
امتحاں کے وقت جب تھا نظم عالم میں خلل   راستبازوں کی کھلی تھی ٹھیک جب ہر سو کل
کھوٹ سے اس آنچ میں نکلا وہ خالص اس طرح
آگ میں تپ کر کھرا رہتا ہے کندن جس طرح

وہ زمانہ جب کہ تھا دلّی میں اِک محشر بپا   نفسی نفسی کا تھا جب چاروں طرف غل پڑ رہا
اپنے اپنے حال میں چھوٹا بڑا تھا مبتلا   باپ سے فرزند اور بھائی سے بھائی تھا جُدا
موج زن تھا جبکہ دریائے عتاب ذوالجلال
باغیوں کے ظلم کا دنیا پہ نازل تھا وبال

دیکھ کر یاروں کو جب آنکھیں چرا جاتے تھے یار   ساتھ دینا تھا کسی کا موت سے ہونا دوچار
یار سے یار آشنا سے آشنا تھے شرمسار   شہر میں تھی چار سو گویا قیامت آشکار
آگ تھی اک مشتعل ایسی کہ تھا جس سے خطر
جل نہ جائیں اُسکے شعلے سے کہیں سب خشک و تر

ہو رہا تھا جبکہ کھوٹے اور کھرے کا امتحاں   کر رہا تھا اپنے جوہر خاک کا پتلا عیاں
ایک جانب تھی اگر خندق تو اِک جانب کنواں   بال سے باریک تر تھی راہ اُن کے درمیاں
راہ رو ڈُگدا رہے تھے اور راہ پُر خوف و خطر
اُس نے دکھلایا کہ یوں چلتے ہیں سیدھی راہ پر

مجرم و بے جرم میں تھا حاکموں کو اشتباہ   عدل تھا مجرم کا دشمن اور بری کا عذر خواہ

مجرموں کے جرم پر دیوار و در تھے سب گواہ پر نہ تھا کوئی شفیع اُن کا کہ جو تھے بے گناہ
ایسے نازک وقت میں مردانگی جو اُس نے کی
اہلِ انصاف اسکو بھولے ہیں نہ بھولیں گے کبھی
بالیقیں جن ملزموں کو اُس نے سمجھا بیخطا مارشل لا میں ثبوت اُن کی صفائی کا دیا
چین سے بیٹھا نہ جبتک ہو گیا اِک اِک رہا جو کہ تھے نادار - کی اُن کی اعانت برملا
زر دیا کھانا دیا کپڑا دیا بستر دیا
بے ٹھکانوں کو ٹھکانا بے گھروں کو گھر دیا
قصے جھگڑوں میں کبھی پڑنے کی خو جسکی نہ تھی دی گواہی جس نے ہرگز جھوٹی یا سچّی نہ تھی
بے گناہوں کے لیے وہ رات دن چکّر میں تھا
پانوں ایک اُسکا عدالت میں تھا اور اِک گھر میں تھا
جبکہ عنقا تھی دیانت بین ابناء الزماں تھی امانت جسکی اُس کے پاس ہلکی یا گراں
خوف میں پاس اپنے رکھا اُسکو مثلِ پاسباں کی حوالے مالکوں کے جب ہوا امن و اماں
ایک عالم ناخداترسی میں جب بیباک تھا
اُس کا دامن تھا کہ ہر دھبہ سے بالکل پاک تھا
وضعداری میں نہ تھا اُس کا زمانہ میں بدل وضع میں اُسکی تغیّر تھا نہ عادت میں خلل
وقت کی تاثیر کا اُس پر نہ چلتا تھا عمل انقلابِ دہر کی زد سے گیا تھا وہ نکل
اُسکے آگے ان نئے سانگوں کی کچھ ہستی نہ تھی
اُس پہ چلتی کچھ زمانہ کی زبردستی نہ تھی

کی تھی جو بچپن سے طرزِ زندگانی اختیار　　اُس میں فرق آیا نہ وقتِ واپسیں تک زینہار
کوہِ راسخ کی طرح تھا ایک حالت پر قرار　　وضع اُس کی - جو کہ تھی وضعِ سلف کی یادگار
قوم کے از یاد رفتہ خواب کی تعبیر تھی
عہدِ عالمگیر و اکبر شاہ کی تصویر تھی

سر پہ دُنیا کے خلائق کا تھا گو بارِ گراں　　پر ہر ایک حالت میں ہلکی پھول سی رہتی تھی جاں
پا بگِل دنیا میں - پر دنیا کے غم سے برکراں　　رنج ہو یا ہو خوشی جب جا کے دیکھو شادماں
ظاہرا پابند تھا دنیا کی رسم و راہ کا
دل مگر پایا تھا ایسا جیسا اہل اللہ کا

منقبض اُس کو نہ مکروہات میں پایا کبھی　　غم سے دنیا کے نہ پیشانی پہ بل لایا کبھی
دل کسی بادِ مخالف سے نہ کملایا کبھی　　تلخیِ دوراں سے چتون پر نہ مَیل آیا کبھی
کی بسر دار المحن میں بزمِ عشرت کی طرح
عُمر کاٹی دوزخِ دنیا میں جنّت کی طرح

مٹ گئی افسوس اِک ایسی سلف کی یادگار　　قوم میں جسکی مثال آیندہ کم دیکھیں گے یار
گُل کھلائے گی نئے گلشن میں اب بادِ بہار　　رنگ ہوگا جن میں لیکن بو نہ ہوگی زینہار
کرتے ہیں جب ان حوادث کے نظر انجام پر
قوم میں اِک ہمکو سنّاٹا سا آتا ہے نظر

اِک زمانہ تھا کہ تھا ہم سے موافق روزگار　　اہلِ علم و فضل و دانش کا نہ تھا ہم میں شمار
ایسے حاصل خیز دنیا میں نہ ہونگے کشت زار　　جیسے مردم خیز تھے اسلام کے شہر و دیار

مرتا تھا کامل تو کامل تر نظر آتا تھا یاں
سورج آتا تھا نکل جب چاند چھپ جاتا تھا یاں

یاں یہ اب پہنچی ہے ہم میں نوبت قحط الرجال
ایک اٹھ جاتا ہے دنیا سے اگر صاحب کمال
دوسری ملتی نہیں دنیا میں پھر اس کی مثال
ذات باری کی طرح گویا کہ تھا وہ بیہمال
ظاہرا اب وقت آخر ہے ہماری قوم کا
مرثیہ ہے ایک کا اب نوحہ ساری قوم کا

سنتے ہیں حالی سخن میں تھی بہت وسعت کبھی
تھیں سخنور کے لیے چاروں طرف راہیں کھلی
داستاں کوئی بیاں کرتا تھا حسن و عشق کی
اور تصوف کا سخن میں رنگ بھرتا تھا کوئی
گاہ غزلیں لکھ کے دل یاروں کے گرماتے تھے لوگ
گہ قصیدے پڑھ کے خلعت اور صلے پاتے تھے لوگ

پر ملی ہم کو مجال نغمہ اس محفل میں کم
راگنی نے وقت کی لینے دیا ہم کو نہ دم
نالہ و فریاد کا ٹوٹا کہیں جا کر نہ سم
کوئی یاں رنگیں ترانہ چھیڑنے پائے نہ ہم
سینہ کوبی میں رہے جب تک کہ دم میں دم رہا
ہم رہے اور قوم کے اقبال کا ماتم رہا

۱۵- ترکیب بند مرثیہ سنہ ۱۸۹۲ء مطابق سنہ ۱۳۱۰ھ

جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ساتویں اجلاس میں بمقام دہلی پڑھا گیا

یہ خاک آج جس پر ہیں جمع اہل آرا
یاں ہو چکے کرشمے کیا کیا ہیں آشکارا
اس باغ میں بہاریں جو جو گذر چکی ہیں
آنکھوں کے روبرو ہے گویا سماں وہ سارا

کل جشنِ فتح تھا یاں ہے آج جشنِ شادی
ہر دم عروج پر ہے اسلام کا ستارا
بلبن کے آج مہماں خاقان ہیں اور سلاطیں
اصطخر ہے کہ دلّی بلبن ہے یا کہ دارا
فیروز شہ کی ہے کل ٹھٹھے سے آمد آمد
دولھا بنا ہوا ہے تزئین سے شہر سارا
تغلق کا آج لشکر تیمور کے مقابل
بہر مدافعت ہے میداں میں صف آرا
مغلوں کے اُڑ رہے ہیں کل جشنِ فتح و نصرت
تیمور سے زمانہ ہے برسرِ مدارا
آتا ہے آج بابر لودی پہ فتح پا کر
ہیں شوقِ شاہِ نو میں پیر و جواں خود آرا
کل سوریوں میں ہر سو بجتے ہیں شادیانے
مغلوں کا آ رہا ہے گردش میں کچھ ستارا
ہے جشنِ فتح پھر آج چغتائیوں میں برپا
اقبال نے ہے گویا مغلوں سے قول ہارا
جس دھوم سے ہے گھر گھر جشنِ جلوسِ اکبر
ہے گرد اُس کے آگے جشنِ قباد و دارا
شاہِ جہاں خوشی سے پھولا نہیں سماتا
تعمیر ہو چکے ہیں شہر و فصیل و بارا
تیاری اِس خوشی میں جشنِ عظیم کی ہے
گویا کہ ہے جہاں میں جشنِ سدہ[1] دوبارا
اطرافِ ہند سے ہیں اعیانِ ملک آئے
پا کر حضورِ شہ سے سب جشن کا اشارا
ارکانِ سلطنت ہیں سب پائے تخت حاضر
بالائے تختِ طاؤس ہے شاہ جلوہ آرا

وہ جشن کرنے والے گو خاک میں نہاں ہیں
پر جشن اُن کے اب تک سب زیبِ داستاں ہیں

اے خاکِ پاکِ دہلی اے تخت گاہِ شاہاں
پیشِ نظر ہیں تیرے سب اگلے ساز و ساماں
ہنگامے اِس زمیں پر لاکھوں ہیں گرم ہر سو
پر کوئی جشنِ قومی آتا نہیں نظر یاں

---

[1] سدہ آگ کو کہتے ہیں جشن سدہ وہ جشن ہے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ دنیا میں سب سے اوّل جمشید نے پتھر میں سے آگ نکلنے کی خوشی میں بڑی دھوم سے ایران میں کیا تھا۔ ۱۲

تقریب جشن جس میں ہو کچھ نہ جز اخوت
ملکوں سے جمع آ کر جس میں ہوئے ہوں اخواں
پائین و صدر کا ہو جس میں نہ کچھ تفاوت
خرد و بزرگ کی ہو جس میں نشست یکساں
جن کو نہ ہو بلاوا حاکم کا اور نہ قدغن
لایا ہو کھینچکر دل اُن کو۔ نہ حکم سلطاں
خادم ہوں جس قدر واں مخدوم قوم کے ہوں
مخدوم جتنے ہوں واں سب قوم پر ہوں قرباں
خاطر کسی سے چاہے کوئی نہ واں تواضع
ہوں خود ہی میزباں وہ اور خود ہی ہوں وہ مہماں
ٹھیرائیں جس کو چاہیں وہ آپ میر مجلس
چاہیں جنھیں بنائیں وہ آپ میرِ ساماں
آئے ہوں اس غرض سے سب ملکے تاکہ سوچیں
دنیا میں کس طرح ہوں ہر سبز پھر مسلماں
ہندوستاں میں کیونکر باقی رہے نشانی
اُس قوم کی کہ تھا کل جن کے وہ زیر فرماں
نکلیں تو کیونکہ نکلیں ذلت سے وہ گھرانے
اعزاز نے تھا باندھا جن کے بڑوں سے پیماں
ان مدرسوں کا کیونکر جاری رہے افاضہ
جن کے سبب ہے زندہ نامِ حدیث و قرآں
جو مسجدیں ہیں بہر ذکر خدائے واحد
محفوظ حادثوں سے کیونکر ہوں اُنکے ارکاں
جو کچھ ہے بھائیوں کی تقدیر میں وہ سر پر
اپنی طرف سے لیکن ہی سعیٔ فرضِ انساں
اے شہ نشینِ اسلام اے معدنِ سلاطیں
اے پائے تخت سادات لیے دارلملکِ مغلاں

تو جشن گاہِ شاہاں ہر عہد میں رہا ہے
ایسا بھی جشن کوئی تجھ میں کبھی ہوا ہے

شاہوں کے جشن تھے وہ یہ جشن قوم کا ہے
شوکت میں وہ بڑے تھے عظمت میں یہ بڑا ہے
دولت کے تھے وہ جلوے ملت کا ہے یہ نقشہ
کاغذ کی تھیں وہ ناویں بیڑا یہ نوح کا ہے
بے روح تھے وہ قالب ہی اس میں روح خوشی
موج سراب تھے وہ یہ چشمۂ بقا ہے
میلے نہ وہ بچھڑتے رُخ ان میں گر یہ ہوتی
رہتا ہے آندھیوں میں روشن یہ وہ دیا ہے

وہ دن گئے کہ نازاں تھی قوم سلطنت پر / اب قوم کو خدا کا یا اپنا آسرا ہے
بس سلطنت یہی ہے مل بیٹھنا ہمارا / یہ چھت نہ سمجھو سر پر یہ سایۂ ہما ہے
گم گشتہ بخت جس کو پھرتے ہیں ڈھونڈھتے ہم / لگتا ہے کچھ تو اس کا لگتا نہیں پتا ہے
وہ مشکلیں کریں گے اب حل نہیں جنھیں کچھ / جن مشکلوں کا ہم کو اور تم کو سامنا ہے
ہم میں اگر مخالف کچھ ہوں اس انجمن کے / معذور ہیں وہ ان سے شکوہ نہ کچھ گلا ہے
فوجِ کمک کو اکثر سمجھا ہے فوجِ دشمن / حملہ کمک پہ اپنی اپنوں نے خود کیا ہے
نادم ہوئے ہیں لیکن روشن ہوا ہے جب دن / انساں سے یہ ہمیشہ ہوتی رہی خطا ہے
قدر ایسی مجلسوں کی مدت میں ہوگی ہم کو / اب تک ضرورتوں نے مضطر نہیں کیا ہے
ہوتی ہے قدر ان کی بنتی ہے جان پر جب / لاتے ہیں تب یہ ناویں جب بیڑا ڈوبتا ہے
گو سب جہاز والے خطرے سے بے خبر ہیں / پر رنگ ناخدا کا کچھ فق سا ہو رہا ہے

آفاتِ بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر روتا ہے ناخدا جب

گلشن میں نقص گل کے سب مٹ چکے نشاں ہیں / پر چین سے عنادل گلشن میں نغمہ خواں ہیں
طاؤس و کبک خوش خوش گلشن میں ہیں خراماں / اور بیٹھے ہاتھ ملتے گلچین و باغباں ہیں
غفلت کی چھا رہی ہے کچھ قوم پر گھٹا سی / بے فکر و بے خبر ہیں بوڑھے ہیں یا جواں ہیں
اتراتے ہیں سلف پر اور آپ ناخلف ہیں / رستہ کدھر ہے ان کا اور جا رہے کہاں ہیں
فضل و کمال ان کے کچھ تم میں ہوں تو جانیں / گر یہ نہیں تو بابا وہ سب کہانیاں ہیں
کھیتوں کو دے لو پانی اب بہ رہی ہے گنگا / کچھ کر لو نوجوانو اٹھتی جوانیاں ہیں
تم سے تھے تو تھا مو عزت کو قوم کی کچھ / اپنے تو قافلے سب پا در رکاب یاں ہیں

ایک خضر رہ نے رستہ سیدھا بتا دیا ہے
رستہ یہ دیکھیں چلتے اب کتنے کارواں ہیں
خدمت میں اُنکی حالی کہتا ہے یہ ادب سے
اس وقت رونق افزایاں جتنے مہرباں ہیں
دنیا میں گر ہے رہنا تو آپ کو سنبھالو
ورنہ بگڑنے کے یاں آثار سب عیاں ہیں
عرصہ ہوا کہ ہمکو آنکھیں دکھا رہے ہیں
قدرت کے قاعدے جو دنیا پہ حکمراں ہیں
جو اپنے ضعف کا کچھ کرتیں نہیں تدارک
قومیں وہ چند روزہ دنیا میں مہماں ہیں
گھڑیال اور مگرمچھ ہیں اُن کو نگلے جاتے
دریا میں مچھلیاں جو کمزور و ناتواں ہیں
سنبھلو وگرنہ رہنا یاں اس طرح پڑے گا
بھیل اور گونڈ جیسے گمنام و بےنشاں ہیں

یہ غفلتیں مبادا اب روزِ بد دکھائیں
دھندلے سے کچھ نشاں ہیں ڈر ہے کہ مٹ نہ جائیں

اَشعارِ مُتفرّقہ

ان میں اکثر وہ اشعار ہیں جو لوگوں کی فرمائش سے خاص خاص موقعوں پر
اُردو یا فارسی وغیرہ میں لکھے گئے ہیں

تمہید رقعہ شادی عروسی

شکر کیجے کونسی نعمت کا خالق کی ادا ایک سے ہے ایک نعمت اُسکی بندوں پر سوا
اُس کی قدرت کے خزانوں میں نہیں ہرگز کمی جس نے جو مانگا وہی اُس نے مہیا کردیا
شجر کو پھل دیا اور پھل کو بخشا رنگ و بو سیپ کو موتی دیا موتی کو دی آب اور ضیا
کھیتیوں کو مینہ دیا۔ ماں باپ کو اولاد دی اُس سے دی دنیا کو رونق اس سے آنکھوں کو جلا
عمر روز افزوں عطا فرمائی پھر اولاد کو کل چھٹی تھی جن کی۔ ہے دن آج اُنکے بیاہ کا
آؤ اُس کے شکر میں سب ملکے باہم شاد ہوں تاکہ صورت سے ہو ظاہر شکرِ انعام خدا

ایضاً

چھٹی بیاہ یا تیج تہوار ہو لب آب یا صحن گلزار ہو
گل و لالہ ہو یا ہو عطر و گلاب مے و نغمہ ہو یا ہو چنگ و رباب

یہ سارے خوشی کے ہیں سامان جب   کہ ہوں ایک جا جمع احباب سب
بزرگوں سے محفل کی شوکت بڑھے   عزیز اور پیاروں سے عزت بڑھے
جہاں اس طرح جمع ہوں چار یار   ہیں اُس بزم پر لاکھ گلشن نثار

ایضاً

شکر کہ از فضلِ خدائے جہاں   وقتِ خوش از پردہ بر آمد عیاں
شادیِ دل را سبب آمد بدست   فرصتِ بزمِ طرب آمد بدست
تا شود از مقدمِ اہلِ کرم   کلبۂ ما غیرتِ باغِ ارم

ایضاً

رفت آسیبِ زمستاں بادِ نوروزی وزید   دوستداراں را بشارت باد و یاراں را نوید
طرحِ بزمِ خُرّمی باہمدگر باید نہاد   نغمۂ شکرِ الٰہی دم بدم باید کشید

ایضاً

سلام من محب مسکین   یلیه الخیر والبرکات تترٰی
سلام ردفه روحٌ و رَّاحٌ   وبین یدیهِ للاحباب بُشرٰی
ودعوة شاهدین وغائبینا   من الاخوانِ والخلانِ طرّا

ایضاً

فالطیب لعیش فی الدنیا وارغدهٗ   وهینة بزیارات الاحبّاء

ایضاً

ہزار دیدہ و دل فرش راہ یارانے کہ از مسرّت یاراں مسرت اندوزند
بہ شادی و طرب ہمہ گر شود انباز ہزار رُخ ز فروغ دلے برافروزند

ایضاً

کارِ احباب ساختن بتواں دوستاں را نواختن بتواں
تا بہ دہر ابر و باد خواہد ماند از شما لطف یاد خواہد ماند

اشعار غزل ناتمام

اِس زندگی کے ہاتھوں چین ایک دن نہ پایا یہ جان ہے بدن میں یا خار پیرہن میں
حاضر ہو جب نہ دل ہی ہے باغ و راغ یکساں ہم دوستو گئے بھی تو کیا گئے چمن میں
ہے اِک خراش دل میں۔ ڈر ہے کہ بھر نہ آئے زخمی ہے قیرواں[۱] میں اور مشک ہے ختن[۲] میں
تو اپنے بھولے پن سے شیدا ہوئی ہے ورنہ اے فاختہ دھرا ہے کیا سرو نارون میں

ایضاً

کس قدر یارو ہوا ہے انقلاب آگیا یاروں کے اقراروں میں فرق
خود بتا دے گا تمھیں دورِ زماں بے وفاؤں اور وفاداروں میں فرق
اُن پہ ہم قرباں ہیں وہ ہم پر نثار ہے بہت یاروں میں اور یاروں میں فرق

ایضاً

گر نہ ہو نیّتِ گدا میں فرق آئے کیوں شاہ کی عطا میں فرق

---

[۱] افریقہ کے کسی علاقے کا ایک شہر۔ ۱۲
[۲] چین کے قریب ایک ملک ۔ ۱۲

ہیں وفادار اور بھی لیکن
ہے مری جاں وفا وفا میں فرق

اشعار قصیدۂ ناتمام

یاد ایّام کہ تھی باغِ جوانی پہ بہار
نظر آتا تھا خزاں میں بھی زمانہ گلزار
نشہ میں چور تھے اِک بادۂ پُر زور سے ہم
جس کا راحت میں نہ کلفت میں اُترتا تھا خمار
سر پہ وہ دیو قوی آکے چڑھا تھا اپنے
یاد تھا جس کا نہ عامل نہ سیانے کو اُتار
روکتا تھا نہ جسے خار نہ خندق نہ کنواں
تھے ہم اُس توسنِ سرزور پہ دن رات سوار
رہتے تھے اُس شترِ مست کی صورت بے قید
ہاتھ سے جس نے شتربان کے تڑالی ہو مہار
پند گو ہوتے تھے جتنے کہ زیادہ دل سوز
اُنکی صحبت سے تھے اُتنے ہی زیادہ بیزار
خیر خواہ اور تھے غمخوار مربّی جتنے
اُنکی صورت سے ہمیشہ ہمیں چڑھتا تھا بخار
مِل کے ہمجولیوں سے جان میں جان آتی تھی
ہنسنے اور بولنے پر زیست کا تھا اپنی مدار
اب اُمنگیں ہیں وہ دل میں نہ ترنگیں باقی
تیرے اے عمر گئے اب وہ کہاں لیل و نہار

صدائے گدایانِ قوم[1]

ڈھونڈھنے خضرِ مبارک پے کو یاں آئے ہیں ہم
چھوڑ کر بھٹکا ہوا اِک کارواں آئے ہیں ہم
ڈر ہے جو خوش دل ہیں وہ سُن کر نہوں پژمردہ دل
سخت عبرت خیز لے کر داستاں آئے ہیں ہم

---

[1] پنجاب کی ایک اسلامی انجمن کی طرف سے چند باہمت لوگوں نے جنھوں نے اپنی جماعت کا نام گدایانِ قوم رکھا تھا ریاست بھاولپور میں چندہ وصول کرنے کے لیے جانے کا ارادہ کیا تھا ان کا قصد رئیس کے حضور میں یہ اشعار پڑھنے کا تھا لیکن غالباً ان کا جانا نہیں ہوا ۱۲

ہند میں اسلام کا پھولا پھلا تھا جو چمن
لیکے اُس کا مژدۂ فصلِ خزاں آئے ہیں ہم
علم جو زندہ کیا تھا آپ کے اجداد[1] نے
آج اِس در پر اُسیکے نوحہ خواں آئے ہیں ہم
قوم کھو بیٹھی ہے جو عبّاسیوں کی یادگار
جستجو میں اُسکی مشعل لیکے یاں آئے ہیں ہم
تاکہ ہو معلوم سب کو قوم کی حالت ہے کیا
اسلیے ڈالے گلے میں جھولیاں آئے ہیں ہم
خود غرض ٹھیرائیں یا مکّار ہم کو یا گدا
ذلّتیں یہ کر کے سب خاطرنشاں آئے ہیں ہم
فخر سب بیجا ہیں اُن کے قوم ہے جنکی ذلیل
فخر و عزّت کے مٹا کر سب نشاں آئے ہیں ہم
ہے بنی ہاشم کی جہاں پروری ضرب المثل
اسلیے یاں بن بلائے میہماں آئے ہیں ہم
تشنگی اپنی بجھائی ہوگی اے آبِ حیات
لیکے مُنہ میں قوم کی سوکھی زباں آئے ہیں ہم

مژدۂ قدوم حضور شاہزادۂ ویلز در ہند

مژدہ ہو اہلِ مشرق اب دن پھرے تمہارے
مغرب سے سوئے مشرق آیا ہے مہرِ تاباں
گلّہ کی اپنے لینے آیا خبر کہاں سے
ہے ایسے گلّہ باں پر گلّہ کی جان قرباں
ہندوستاں بھی تجھ سے کچھ آجکل نہیں کم
اے معدنِ بزرگی اے خاکِ انگلستاں
تیرے نصیب کا تو کیا پوچھنا ہے لیکن
ہندی بھی اِن دنوں ہیں قسمت پہ اپنی نازاں
مہماں ہے آج اُن کا اُس شاہ کا ولیعہد
روے زمیں کے سلطاں جسکے ہوئے ہیں مہماں

---

[1] چونکہ رئیس بھاولپور بنی عباس میں سے ہیں اور عباسیوں کی خلافت میں علم کو بہت ترقی ہوئی تھی اس لیے یہ مضمون اس طرح ادا کیا گیا - ۱۲

شکریہ عطائے مدرسۂ نواب غازی الدین خاں مرحوم واقع اجمیری دروازہ دہلی بحضور ہِز جیمس لائل لفٹننٹ گورنر بہادر پنجاب (از طرف طلبائے اینگلو عربی اسکول دہلی

آئیے[1] اے دلی کے دل آرا　شہر دعا گو سب ہے تمھارا
شکر کا ہم کو گو نہیں یارا　پر یہ ہے کہنا فرض ہمارا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا
ہے دلی کے فخر کا یہ دن　شہر میں آیا شہر کا محسن
وصف تمھارا گو نہیں ممکن　رہ نہیں سکتے پر یہ کہے بن
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا
آپ نے ہم پر بھیجے ہیں افسر　کیسے کیسے رعیت پرور
جن سے ہے ہندستان منور　فخر ہے انگلستان کو جن پر

---

[1] یہ نظم چونکہ صغیر سن طالب علموں کے لیے لکھی گئی تھی تاکہ وہ ہز ہائی نس کے روبرو مجتمع ہو کر بطور کورس کے گانے کی لے میں پڑھیں اس لیے بچوں کی سمجھ کے موافق نہایت سیدھے سادھے الفاظ جمع کر دیے گئے ہیں۔ ۱۲

جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا
اُرکلارک احسان کا پتلا   آدمی کی صورت میں فرشتہ
تھا دلّی پر فضل خدا کا   تم نے جو دلّی میں اُسے بھیجا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا
آب و ہوا سے شہر کی ساری   آئی تھی خلقت جان سے عاری
تم نے لگا کر نل اِک باری   چشمۂ حیواں کر دیا جاری
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا
یوں تو ہیں سب احسان مسلّم   سب سے ہے یہ احسان مقدم
تھے تعلیم میں کم سب سے ہم   تو نے مدد کی اپنی پیہم
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا
جوبلی کے جو خاص وظیفے   پانچ برس کو ہم کو ملے تھے
لطف سے میعاد اُن کی بڑھا کے   جیت لیے دل آپ نے ہم سے
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا
مدرسہ تھا بے ٹھور ہمارا   تھا نہ کہیں ٹکنے کا سہارا

مانگے تانگے پر تھا گذارا   مٹ گیا اب خلجان یہ سارا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

آپ کو ہم پر رحم جو آیا   گھر یہ عطا ہم کو فرمایا
حکم مرمت کا بھجوایا   ٹوٹے پھوٹے کو بنوایا
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

درس کے کمرے جس میں ہیں اکثر   قدر ضرورت سے کچھ بڑھ کر
بورڈروں کے رہنے کو ہیں گھر   کھیلنے کو میداں ہے سراسر
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

شہر میں جا کالج کو عطا کی   کیں اصلاحیں آب و ہوا کی
شہر کی جو حاجت تھی روا کی   شرطِ حکومت تم نے ادا کی
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

تم میں ہیں جو موجود فضائل   وہ نہیں کچھ محتاج دلائل
لوگ سب اُنکے دل سے ہیں قائل   او! سرلائل - او! سرلائل
جب تک شہر آباد رہے گا
نام تمھارا یاد رہے گا

اشعار مدحیّہ

بحضور سر ڈینس فٹز پیٹرک لفٹنٹ گورنر بہادر پنجاب - انبالہ کے ایک بانی مدرسہ کی طرف سے

قیصر ہند کے ہیں سیکڑوں احسان جہاں
اِس کا پنجاب پہ ہے سب سے بڑا یہ احساں

حکمراں آئے ہیں پنجاب پہ اب تک جتنے
ایک سے ایک کا پلّہ ہے عدالت میں گراں

جبکہ سر چارلس نے پنجاب کو چھوڑا اُس دم
وقتِ رخصت تھا ہر اک اُنکو بہ حسرت نگراں

حال جو ہوتا ہے بچوں کا بچھڑ کر ماں سے
یہی احوال تھا پنجاب کا بے وہم و گماں

جانشین اُن کے ہوئے آن کے جب سر لائل
عہدِ سابق کو گئے بھول سب اَبنائے زماں

شکر سے عہدہ برآ اُس کے نہیں ہو سکتے
رحم و انصاف ہوا ذات سے جو اُن کی عیاں

اُٹھ گیا سر سے جب اس ملک کے سایہ اُن کا
ہاتھ میں آپ نے لی آکے حکومت کی عناں

کارفرما تھے جب اضلاع میں پنجاب کے آپ
معدلت آپکی اُسوقت سے مشہور رہے یاں

حیدرآباد میں - میسور میں - کلکتہ میں
نیکنامی کے کیے کام رہے آپ جہاں

ہے یہ اب آپ سے اُمید کہ پنجاب میں بھی
مشکلیں آپ سے سب ملک کی ہونگی آساں

بعد سر لائل و سر چارلس کے سر ڈینس بھی
چھوڑ جائیں گے ہر اِک دلمیں عقیدت کے نشاں

انگریزی اشعار کا ترجمہ

وہ دل رُبا اُمیدیں جن پر کہ تو ہے شیدا
جب دور تیرے دل سے ہو جائیں گی سراپا

وہ عالمِ جوانی جس پر کہ تو ہے مفتوں
جائے گا ٹوٹ جس دم اُس کا طلسم سارا

جن دوستوں کی خاطر چھوڑا ہے تونے اُسکو
تھا جو کہ تجھکو اپنا آرام دِل سمجھتا

چل دینگے جب وہ سارے اُن بلبلوں کی مانند   بعد از بہار جو رُخ کرتی نہیں چمن کا
جب ہو چکے گا آخر یہ عیش کا زمانہ   کون آکے دیگا تجکو اس کے سوا سہارا
بے مہریوں سے تو نے جس کو کیا ہے غمگیں   تیری خبر وہی کچھ لے گا تو آکے لے گا
جس طرح وہ پرندہ جو فصلِ گُل میں جا کر   پھر موسمِ خزاں میں آکر ہے ہم سے ملتا

دولت اور وقت کا مناظرہ

ایک دن وقت نے دولت سے کہا   سچ بتا تجھ میں ہے فوقیت کیا
تو ہے سرمایۂ عزت یا میں   تو ہے انسان کی دولت یا میں
ہے زمانہ میں بڑی بات تری   دیکھیں ہم بھی تو کرامات تری
وقت سے ہنس کے یہ دولت نے کہا   تجکو اے وقت نہیں عقل ذرا
ہے عجب جس کو خدائی مانے   اُسکی تو خوبیوں میں شک جانے
سبز ہے گلشنِ دُنیا مجھ سے   لیتے ہیں توشۂ عقبےٰ مجھ سے
نام **اقبال** ہے آنے کا مرے   لقب **ادبار** ہے جانے کا مرے
مجھ سے پاتے ہیں ہُنر نشو و نما   علم بھی ایک طفیلی ہے مرا
لاکھ رکھتا ہو کوئی فضل و کمال   لاکھ رکھتا ہو کوئی حسن و جمال
خوبیاں لاکھ کسی میں ہوں مگر   میں نہ ہوں۔ تو نہیں کچھ قدرِ بشر
چند روز آگئی میں جس کے کام   زندہ تا حشر رہا اُس کا نام
جس سے مجھ کو نہ سروکار رہا   وہ سدا خوار و نگوں سار رہا
مُنھ ذرا جس کو لگا لیتی ہوں   اُس کی میں شان بڑھا دیتی ہوں

چاہتے ہیں مجھے سب خرد و کلاں　　پھرتے ہیں دُھن میں مری پیر و جواں
گر نہ ہوں میں تو کوئی کام نہ ہو　　کسی آغاز کا انجام نہ ہو
کوئی حاجت نہ ہو دُنیا کی روا　　درمیاں گر نہ قدم ہو میرا
ہیں رُکھائی سے مری سب لرزاں　　میرے اغماض سے ڈرتا ہے جہاں
جس سے دُنیا میں نہیں راہ کروں　　ہو اگر شیر تو روباہ کردوں
الغرض ہے مری وہ شانِ عظیم　　کرتے آئے ہیں جسے سب تسلیم
جڑ سمجھتے ہیں خوشی کی مجھکو　　میری عظمت نہیں باور تجھکو
تو بتا فخر ہے تجھ میں وہ کیا　　جس نے مجھ سے تجھے گمراہ کیا
وقت نے سُن کے کہا اے دولت　　شک نہیں اس میں ذرا اے **دولت**
ساری تو خوبیوں کی جڑ ہے مگر　　اپنی جڑ کی نہیں کچھ تجکو خبر
تو جو اپنے پہ ہے نازاں اِتنی　　اپنی ہستی سے ہے غافل کتنی
کیجئے فرض تجھے گر چشمہ +　　تو ہوں اِس چشمہ کا میں سرچشمہ
میں ہوں یا تو ہے اساسِ امکاں؟　　پہلے دریا ہے کہ مچھلی ناداں
تو جو کھیتی ہے تو رقبہ میں ہوں　　تو جو موتی ہے تو دریا میں ہوں
ہے قرابہ ترا اگر عطر آگیں　　میں ہوں اِس عطر کی واللہ زمیں
ہے عبث تجکو تفوّق کا خیال　　تو ہے گر مال تو میں راس المال
جن کے قبضے میں ہوں میں اے دولت　　تجھ پہ رکھتے ہیں وہ دستِ قدرت
لاکھ بار اُن سے اگر بھاگے تو　　بڑھ کے جا سکتی نہیں آگے تو
اُن کی مٹھی میں ہے تو اے دولت　　طائرِ رشتہ بپا کی صورت

نہ کہیں جس کا بدل ہے مفقود   جس کا نایاب ہے عالم میں وجود
کھو کے مجکو کوئی پاتا نہیں پھر   جا کے میں ہاتھ سے آتا نہیں پھر
ایک پل میری اگر دیجے گنوا   لیجے ہاتھ اُس سے ہمیشہ کو اُٹھا
تو اگر اپنی لٹا دے ثروت   پل وہ ملتی نہیں پھر اے دولت
ہیں اِسی واسطے جو اہلِ تمیز   میری ایک ایک پل اُن کو ہی عزیز
میرے جو لوگ کہ ہیں قدرشناس   ہے مرا جاگتے سوتے انھیں پاس
جانتے ہیں حکما و عرفا   مجکو سرمایۂ دین و دُنیا
دل میں جن کے مری کچھ قدر نہیں   ان کی قسمت میں نہ دنیا ہے نہ دیں
نہ کوئی کام ہو اُن سے انجام   نہ ارادہ ہو کوئی اُن کا تمام
نہ انھیں دین کی دولت ہاتھ آئے   اور نہ دُنیا کبھی ان سے پتیائے
نہ ادا صوم ہو اُن سے نہ صلوٰۃ   نہ ہو قدرت میں حج اُن کی نہ زکوٰۃ
نہ مدد اُن سے کچھ اپنی کی جائے   نہ خبر اُن سے کسی کی لی جائے
گُن تو ہیں مجھ میں بہت اے دولت   ہے مگر تنگ مجالِ فرصت
بس زیادہ نہیں مہلت مجکو   بحث کی اب نہیں طاقت مجھکو

اِس میں ہے میرا سراسر نقصان
کہ ہے انمول مری ایک ایک آن

ناقصوں کے دعوے کاملوں کے سامنے فروغ نہیں پاتے

ہے لیاقت جن میں کچھ قدرے قلیل   اور سمجھتے آپ کو ہیں بے عدیل
اُن کو ایسوں سے نہیں ملنا روا   جو لیاقت رکھتے ہیں اُن سے سوا
اونٹ اگر سمجھے بڑا اپنے تئیں   دیکھنا لازم پہاڑ اُس کو نہیں
سر میں ہے جگنو کے یہ سودا اگر   شے نہیں مجھ سے کوئی تابندہ تر
چاہیے دن کو نہ نکلے زینہار   ورنہ ہوگا اپنے جی میں شرمسار

قطعاتِ تاریخ اور تاریخی جملے

مقتبس از قرآن مجید

راقم کو فی الواقع مادہ تاریخ نکالنے کا ڈھب نہیں ہے اور کبھی ایسی ضرورت پیش آتی ہے تو نہایت دقّت سے اکثر تخرجہ یا تعمیہ کے ساتھ اور کبھی حسنِ اتفاق سے بغیر اس کے بھی تاریخ سرانجام ہوئی ہے بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ مادہ تاریخ کسی دوست نے نکال دیا اور اُس پر صرف مصرعے نکال کر تاریخ کے خود مالک بن بیٹھے لیکن چونکہ غلطی سے تاریخ گوئی کو جزو شاعری سمجھا گیا ہے اِس لیے اکثر طوعاً و کرہاً یاروں کی فرمائش سے اور کبھی کبھی اپنی اُپج سے بھی تاریخیں لکھنی پڑی ہیں

ایک بزرگ کے پاس لوگ اکثر تعویذ گنڈے کے لیے آیا کرتے تھے ایک روز فرمانے لگے کہ عباسیوں کے عہد میں ایک شخص نے نبوّت کا دعوےٰ کیا۔ لوگ ایک قفل کو بند کر کے اُس کے پاس لے گئے کہ اگر تو فی الواقع خدا کا بھیجا ہوا ہے تو یہ قفل بغیر کنجی کے کھول دے۔ اُس نے کہا کہ بھائی میں نے نبوّت کا دعویٰ کیا ہے۔ آہنگری کا دعویٰ نہیں کیا۔ اِن کا مطلب اِس نقل سے یہ تھا کہ ہم نے خدا کی طلب میں درویشی اختیار کی تھی یہ معلوم نہ تھا کہ عامل اور سیانا بھی بننا پڑے گا۔ یہی حال ہمارے مُلک

میں اُن لوگوں کا ہے جو شاعری میں بدنام ہیں۔ وہ اور تو کسی مصرف کے سمجھے نہیں جاتے اور درحقیقت ہیں بھی نہیں البتہ لوگوں کی غرض کبھی کبھی ان سے اُس وقت متعلّق ہو جاتی ہے۔ جب کوئی مہتم بالشّان واقعہ ظہور میں آتا ہے۔ مثلاً کسی کے اصطبل کی مرمّت ہوئی یا گھوڑا آختہ کیا گیا یا کسی کی مینا مر گئی یا مرغ پالی جیتا یا بلّی نے بچے دیے۔ ایسے وقت میں شعرا کو مقابلے کے امتحان کا موقع مل جاتا ہے۔ جو شخص مادّہ تاریخ فی الواقع یا صاحبِ فرمائش کے نزدیک سب سے اچھا نکال لاتا ہے۔ اُس کا فی الجملہ اعتبار بڑھ جاتا ہے۔ راقم چونکہ تاریخ نکالنے میں سدا کا ہیٹا تھا۔ اِس لیے ہمیشہ اِس امتحان سے کتراتا رہا۔ لیکن بُری بھلی چند تاریخیں جو کبھی کبھی دوستوں یا بزرگوں کی فرمائش یا اپنے دل کی خواہش سے لکھیں تھیں اُن میں سے جس قدر سر دست بہم پہنچیں دیوان میں شامل کر دی گئیں تاکہ دیوان کے ضروری اغلاط میں سے ایک غلط کم نہ ہو جائے۔

تاریخ وفات مرزا غالب مرحوم دہلوی

غالب نے جبکہ روضۂ رضواں کی راہ لی
ہر لب پہ آہ سرد تھی ہر دل میں درد تھا
اُس دن کا کچھ اہلِ شہر کی افسردگی نہ پوچھ
دنیا سے دل ہر اپنے پرائے کا سرد تھا
حالی کہ جس کو دعوئے تمکین و ضبط ہے
دیکھا تو دل پہ ہاتھ تھا اور رنگ زرد تھا
تھا گو وہ اک سخنورِ ہندوستاں نژاد
عرفی و انوری کا مگر ہم نبرد تھا
اس قافلہ میں آکے ملا گو وہ سب کے بعد
اگلوں کے ساتھ ساتھ مگر رہ نورد تھا

ہم اور صبح و شام یہ اندوہِ جانگزا دل تھا کہ فکرِ سال میں بے حرفہ گرد تھا
ناگاہ دی یہ غالبِ مرحوم نے صدا (سچ ہے کہ خواجہ راہنمائی میں فرد تھا)

تاریخ ہم نکال چکے پڑھ بغیر فکر
۱۲۱۱ ۳۰۰
حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا[1]
۱۲ھ۸۵

تاریخ وفات محمدؐ ابراہیم جواں مرگ طالب علم بی اے کلاس دہلی کالج

محمدؐ ابراہیم چوں ترکِ جاں گفت ز نخلِ جوانی ثمر برنخوردہ
بگفتم ز روے الم سالِ فوتش بجاں آفریں جانِ شیریں سپردہ
۱۲۹۳ھ

تاریخ وفات سید خواجہ ناصر وزیر مرحوم دہلوی

جب ہوئے ناصر وزیر راہیِ ملکِ بقا سب ہوئے اندوہگیں شہر کے برنا و پیر
دل نے کہا ہر جگہ بھیجتی ہے چیز اک خدا باغ میں نسرین و گل چرخ پہ مہرِ منیر
عیش میں شعر و غزل سوگ میں تاریخ مرگ غیب سے آئی ندا- خلد میں ناصر وزیر
۱۲-۹۸ھ

---

[1] یہ تاریخ خود غالبِ مرحوم کی غزل کے ایک مصرعہ سے نکالی گئی ہے- ان کی غزل کا مقطع یہ ہے

یہ لاش بے کفن اسدِ خستہ جاں کی ہے حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا
۲۷۹۶ھ

آخر مصرعہ کے اعداد ۲۷۹۶ ہوتے ہیں- جب ان میں سے لفظ تاریخ کے عدد یعنی ۱۲۱۱ اور لفظ فکر کے عدد یعنی ۳۰۰ کا تخرجہ کیا گیا ۱۲۸۵ باقی رہے اور یہی ان کا سالِ وفات ہے

مختصر صورت تاریخ کی یہ ہوئی ۲۷۹۶ - (۱۲۱۱ + ۳۰۰) = ۱۲۸۵ھ

تاریخ طبع جغرافیہ بےمثال مؤلفہ خواجہ سید شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

وہ جغرافیہ جس کی تھی احتیاج   چھپا مژدہ اے طالبانِ کمال
نئی طرز کا ہے یہ جغرافیہ   عیاں جس سے ہے ربع مسکوں کا حال
ملی طرفہ تر اس کی تاریخِ طبع   وہ خود طرفہ ہے جیسے بے قیل و قال
اگر سالِ ہجری کی ہے جستجو   تو "جغرافیہ" خود بتاتا ہے سال
۱۳۰۲ھ
ہو مطلوب تاریخ گر عیسوی   کہو اسکو "جغرافیہ بے مثال"
۱۸۸۴ع

تاریخ بپایاں رسیدن بنائے سید مہربان علی مرحوم رئیس گلاؤٹھی در بلند شہر

علی آں سیدِ والا کہ باشد   بنامش مہرباں جزوے ز اجزا
بود با ذاتِ او توام سیادت   چناں کز نامِ او مہرست پیدا
چو ایں کاشانہ را بنیاد بنہاد   بعہدِ حاکمِ بیدار و دانا
گروس آں فیض گستر کز وجودش   شد ایں معمورہ چوں گلشن سراپا
چنیں بنوشت حالی سالِ تعمیر   مکانِ بے نظیر آباد بادا
۱۲۹۹ھ

تاریخ اورنگ نشینی حضور آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علی خاں بہادر فرمانروائے ملک دکن

بسالِ فرخ و ماہ سعید و روز فرخندہ   نظام الملک محبوب علی خاں آصفِ ثانی
بہ تختِ سلطنت بنشست حالی گفت تاریخش   برائے شہ مبارک تاج و اورنگ جہانبانی
۱۳۰۱ھ

تاریخ تالیف قواعد اردو مؤلفہ خواجہ شہاب الدین حسن صاحب دہلوی

قواعد ہے یہ اردو کی کہ جس کا   بیاں شافی ہے اور ترتیب محکم
کتابیں اس سے پہلے تھیں بہت سی   زیادہ حجم میں اور نفع میں کم
مگر یہ مختصر ہے اک رسالہ   کہ ہیں جس میں قواعد سب فراہم
وجود اس کا ہے گو سب سے مؤخر   یہ خوبی میں ہے اکثر سے مقدم
جو قیمت پوچھیے تو ہے بہت سہل   نہ دینار اس میں لگتے ہیں نہ درہم
اگر نام اس کا تاریخی ہو مطلوب   تو ہے اے طالبو "اکسیر اعظم"
۱۳۰۲ھ

تاریخ رحلت نواب ضیاء[1] الدین احمد خاں مرحوم دہلوی

دردا کہ ضیاء دین احمد بر بست   رخت سفر از جہاں کہ جائے الم است
۹۲۹
از طاق و ز ایوان و ز بزم جلسا   بگسستہ بہ رحمت الٰہی پیوست
۱۱۰ ۶۸ ۴۹ ۹۴   ۶۹۴

تاریخ طبع دیوان منشی اقبال حسین صاحب متخلص بہ عاشق

جواں مرد آزادہ عاشق کہ نیست   در اقران خود کس مر او را قریں
نہ صیاد و ہموارہ از حسن خلق   پئے صید آزادگاں در کمیں
نہ سحارہ پیوستہ ز افسون نطق   کشد ز آشیاں بازو شیر از عریں[2]
ہمی بارد از جبہ اش انبساط   اگر مہرباں ست و گر خشمگیں
نہ بینیش گرہ کہ بر ابرواں   نہ یابیش افتادہ چیں بر جبیں
دو سال ست کافسون مہر و وفاش   ربودست صبرم ز جان حزیں

---

[1] یہ تاریخ اس طرح نکلتی ہے کہ ۹۲۹ میں سے جو کہ ضیاء دین احمد کے اعداد ہیں۔ ۳۲۱ جو کہ طاق ایوان۔ بزم اور جلسا کے اعداد کا مجموعہ ہے۔ تخرجہ کر کے باقی یعنی ۶۰۸ کو ۶۹۴ میں جو کہ رحمت الٰہی کے اعداد ہیں ملانے سے ۱۳۰۲ حاصل ہوتے ہیں اور یہی نواب مرحوم کا سال وفات ہے۔ مختصر صورت تاریخ کی یہ ہے۔

۹۲۹ (۱۱۰ + ۶۸ + ۴۹ - ۹۴) = ۶۰۸ + (۶۹۴) = ۱۳۰۲ھ

[2] عرین = بن، کچھار۔

ولے دیر پیوند نا آشنا +
کہ بودست فارغ ز مہر و ز کیں

ندانم کہ عاشق چہ افسوں دمید
کہ در باخت خود را بمہرش چنیں

سر رشتہ ہیہات دادم ز دست
سخن ز آسماں بود و رفت از زمیں

کنوں رانم از طبعِ دیوانِ سخن
کہ شد جلوہ فرما بہ نوعے گزیں

دریں روزہا کز صُروفِ زماں
سخن شد مہان و سخنور مہیں

عروسِ سخن مے نیرزد بجو
بحسن ار بود غیرتِ حورِ عین

صد آباد بر عاشق و عزمِ او
کہ در دَورِ ناسازگاری چنیں

ز معنی نہ بیگانہ وُ آشنا
فشاندست گنجینہ از آستیں

چو دیوانِ اُردوے عاشق کہ ہست
صنم خانۂ طرفہ گفتی ز چیں

بہ پیرایہ طبع آراستند
شنیدند از ہر کنار آفریں

سخن کش نبود ارزشے در جہاں
ز شادی نہ گنجید در پوستیں

چو حالی ہمے جُست تاریخِ طبع
صنم خانہ عاشق آمد سنیں

تاریخ بناے چاہ در محوطۂ مدرسۃ العلوم مسلمانان واقع علی گڑھ بحساب سال بعثت خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم

بحسنِ سعی جناب آنریبل سر سید احمد خاں بہادر

بدایت کیجیے گر سالِ ہجرت کی محرّم سے
تو کہیے سالِ بعثت کا مہِ شوّال کو مبدا

کلام اللہ اُترا آخرِ ماہِ مبارک میں
ہوا اسواسطے شوّال مبدا سالِ بعثت کا

نکالے یہ مبارک سن جنابِ سید احمد نے
بنایا جس نے دار العلم میں یہ چشمۂ زیبا
زروئے سالِ بعثت چونکہ تھی تاریخ کی خواہش
کہا ہاتف نے حالی سے کہ چشمہ فیضِ احمد کا
۱۳۱۲ نبوی

تاریخ طبع ترجمہ تاریخ دربارِ قیصری بحساب سالِ عیسوی

پنجاب کے ادارۂ تعلیم عام نے
ایک اور کام ملک کے حق میں کیا ہے خوب
دربارِ قیصری کی جو تاریخ تھی چھپی
اب ترجمہ اُسی کا مرتب ہوا ہے خوب
ہیں لفظ دلکشا تو مضامیں ہیں دل نشیں
ہے ترجمہ نفیس تو طرزِ ادا ہے خوب
چھپ کر ہوا تمام تو حالی نے یوں کہا
دربارِ قیصری کا مُرقّع چھپا ہے خوب
۲ ۸ ۸ ۱ ۶

تاریخ بنائے مہمان سرا در موضع مون واقع پنجاب بحساب سالِ عیسوی

بحسبِ کرم آں وزیر چند کہ باقی ست
نام بزرگانِ مون زبذل و نوالش
ساختہ منزل گہے چو بہر غریباں
تکیہ گہ ہر غریب آمدہ سالش
۷ ۷ ۸ ۱ ۶

تاریخی جملے مقتبس از قرآن مجید

تاریخ وفات غفراں مآب نواب محمد مصطفٰے خاں مرحوم دہلوی رئیس جہانگیرآباد متخلص بہ حسرتی و شیفتہ

جزاھُم بِمَا صَبَرُوا جَنّاتٍ وَّحَرِیرًا ط

آیۂ قرآنی میں بِمَا صَبَرُوا جَنَّۃً وَّحَرِیرًا ہے۔ چونکہ تاریخ وفات میں ایک عدد کی کمی رہتی ہے۔ اس لیے جَنَّۃً کی جگہ جَنّاتٍ کر دیا گیا ہے۔ جیسا کہ نواب آصف الدولہ کی مشہور تاریخ میں بجائے رُوحٌ وَّرَیحانٌ وَّجَنَّۃُ نَعِیم کے ھٰہُنا رُوحٌ وَّرَیحانٌ وَّجَنّاتُ النَّعِیم کر دیا ہے۔

چونکہ نواب مرحوم نے مرض الموت میں مرض کے شدائد و آلام بے نظیر صبر و استقلال کے ساتھ برداشت کیے تھے۔ اِس لیے اس آیت کا مضمون اُنکی وفات کے نہایت مناسب تصوّر کیا گیا یعنی جناب باری نے بعوض اُن کے صبر کے بہشت اور بہشت کا لباس اُن کو عطا کیا۔

تاریخ وفات نواب محمد نقشبند خاں مرحوم ولد اوسط نواب محمد مصطفےٰ خاں مرحوم رئیس جہانگیر آباد

وَحُلُّوْا اَسَاوِرَ مِنْ فِضَّۃٍ

(۱۲۹۴ھ)

چونکہ عزیز موصوف ایک وجیہ و شکیل آدمی تھے اور اُن کی وفات عنفوانِ شباب میں واقع ہوئی تھی۔ اِس لیے یہ آیت اُن کی تاریخ وفات کے لیے نہایت مناسب اور موزوں سمجھی گئی۔ اللہ تعالیٰ اہلِ جنّت کے ذکر میں ارشاد فرماتا ہے کہ ”پہنائے گئے اُن کو چاندی کے کنگن“۔ بجائے مضارع کے ماضی کا لفظ استعمال فرمایا گیا ہے۔ گویا اُن کی مغفرت ہو چکی اور اہلِ جنّت کے تمام حقوق اُن کو مل چکے۔

یہ ایک عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ باپ اور بیٹے دونوں کی تاریخ وفات قرآن مجید سے برآمد ہوئی۔ پھر ایک ہی صورت یعنی سورۂ دہر سے نکلی اور دونوں آیتیں اہلِ جنّت ہی کے ذکر میں واقع ہوئی ہیں۔

تاریخ بنائے آئینہ خانہ در ریاستگاہ بہاول پور

کاَنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنَ الْقَوَارِیْرَ

قرآنِ مجید میں اصل آیت ”اِنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنَ القواریر“ ہے تاریخ

میں بضرورت تکمیل اعداد اور نیز بمقتضائے مقام اِنَّہٗ کی جگہ کانّہٗ کر دیا گیا ہے۔ مگر چونکہ اس سے بھی اعداد پورے نہیں ہوتے تھے اس لیے قواریر میں الف، لام بڑھا کر القواریر کر دیا گیا ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السّلام کے ہاں جب سبا کی بادشاہ زادی بلقیس اوّل ہی دفعہ وارد ہوئی تو اس کو شیش محل کے صحن پر جس میں آئینے لگے ہوئے تھے یہ گمان ہوا کہ گویا پانی بھرا ہوا ہے۔ اُس نے فوراً پائینچے چڑھا لیے۔ حضرت سلیمان نے کہا "اِنَّہٗ صَرْحٌ مُّمَرَّدٌ مِّنْ قَوَارِیْرَ" یعنی یہ تو ایک محل ہے جس میں شیشے جڑے ہوئے ہیں۔ تاریخ بنا میں اِنَّہٗ کی جگہ کانّہٗ کر دینے سے یہ معنی ہو گئے کہ گویا وہی سلیمان کا شیش محل ہے۔

یہ تاریخ ایک دوست کی فرمائش سے جو اُس وقت بھاول پور میں ملازم تھے بھیجی گئی تھی مگر ایسا سُنا گیا تھا کہ پسند نہیں آئی نہ اس لیے کہ اس میں دو جگہ اپنی طرف سے تصرّف کیا گیا ہے بلکہ اِس لیے کہ نواب صاحب کا نام اس میں نہیں تھا۔ (اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط مرتب)

تاریخ ولادت فرزند در حرم سرائے نواب سر آسمان جاہ بہادر مدار المہام سرکار عالی

حاش للہ ما ھٰذا بشرًا۔ اِنَّ ھٰذا الا ملک کریم

اِس آیت سے سنینِ مطلوبہ ۱۳۰۸ھ اس طرح نکلتے ہیں کہ آیت کے جملہ اولیٰ یعنی

لحاش للہ ما ھٰذا بشرا کے اعداد ۱۶۵۴ ہیں ان میں سے ھٰذا کا تخرجہ اور مَلَکٌ کَرِیْمٌ کا بجائے اس کے تعمیہ کرنے سے ۱۳۰۸ حاصل ہو جاتے ہیں۔

تخرجہ و تعمیہ کا اشارہ گویا "اِنَّ ھٰذَا اِلَّا مَلَکٌ کَرِیْمٌ" سے نکلتا ہے کیونکہ اس جملہ کا ترجمہ اگر یوں کیا جائے کہ نہیں ہے "ھٰذا" مگر "مَلَکٌ کَرِیْمٌ" تو اس سے یہ مطلب مستفاد ہوگا کہ اوپر کے جملے میں ھٰذا کی جگہ مَلَکٌ کَرِیْمٌ رکھدو اور اس طرح ۱۳۰۸ حاصل ہو جائیں گے۔

اصل آیت میں حاش للہ ہے بضرورت لام اضافہ کرکے لحاش کر دیا گیا ہے۔ آیت کا ترجمہ یہ ہے (حاش للہ یہ بشر نہیں ہے یہ تو ہو نہ ہو کوئی معزز فرشتہ ہے) جو عورتیں زلیخا کی فریفتگی پر اُس کو ملامت کرتی تھیں جب حضرت یوسف دفعۃً اُن کے سامنے آئے تو اُس وقت جو الفاظ اُن کے مُنہ سے نکلے تھے اُن کو قرآن میں اِس طرح نقل کیا گیا ہے۔

تاریخ وفات مہین برادر راقم جناب خواجہ امداد حسین مرحوم متخلص بہ مظہر

سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی
۱۳۰۳

یہ تاریخ برادر زادہ راقم حافظ اخلاق حسین سلمہ اللہ تعالیٰ نے اپنے والد مرحوم کی وفات سے چند روز بعد عین تلاوت کے وقت قرآن مجید سے

اقتباس کی بھی جس سے بے کم و کاست سالِ وفات برآمد ہوتا ہے۔ چونکہ یہ مادّہ ندرت سے خالی نہ تھا۔ اِس لیے بوجہ اتحاد کے اپنی تاریخوں کے ساتھ اِس تاریخ کو بھی شامل کر لیا گیا ہے۔ یہ تاریخ برادر مرحوم کے سنگ مرقد پر جو کہ دلّی میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرّہٗ کے جوار میں واقع ہے کندہ ہے۔

قطعات تاریخ از نتائج طبع جناب خواجہ امداد حسین مرحوم متخلّص بہ مظہر

چونکہ برادر مرحوم کی بہت سی تاریخوں میں سے یہ چند قطعے باقی رہ گئے تھے اور اُن کی اشاعت کے لیے کوئی اور موقع نہ تھا اس لیے بطور یادگار کے ان کو بھی اپنے دیوان میں شامل کر لیا گیا ہے۔

تاریخ وفات جناب مولٰینا قلندر علی زبیری پانی پتی غفر اللہ لہٗ متخلّص بہ عالم

آن قلندر علی وحید زماں   در نجابت زبیری و سندی
خاک پانی پت از سکونت او   در جہاں شد علم بہ مستندی
مُردہ باخویش بُرد حکمت و علم   مانند خلقے بہ کوے نابلدی
جز دل او کہ بود جملہ صفا   نقد ہر کیسہ جیبد دست دزدی

ما تتہ
P-

جز کتابش[1] کہ بد ہمہ حسنات   درج ہر نامہ نیکی ست و بدی
گفت سالِ وفاتِ او مظہر   رفت عالم[2] بہ جنتِ ا بدی
۱۲۹۳ھ

تاریخ وفات حافظ سعد اکبر مرحوم بانی مدرسہ اسلامیہ پانی پت

چو سعد اکبر آں یاری گرِ قوم   کہ مر اہلِ وطن را بود یاور
سوئے جنت ز دنیا رخت بربست   ازیں غم تافت دلہا ہمچو آذر
دریغ آں نیک خواہِ جملہ احباب   دریغ آن غمگسارِ ہر برادر
دریغ آں درس گاہِ اہلِ اسلام   کہ ماند از مُردنش بے برگ و بے بر
چنیں سالِ وفاتش یافت مظہر   شدہ جنّت مقامِ سعد اکبر
۱۳۰۰ھ

تاریخ اورنگ نشینی حضور نواب آصف جاہ نظام الملک میر محبوب علی خاں بہادر دام اقبالہٗ فرمانروائے دکن

شاہِ دکن چون نہاد حسبِ مُرادِ عباد   افسرِ دولت بہ فرق پائے بر اورنگ داد
سالِ جلوسش خرد گفت کہ بے سر شدہ   فتنہ وُ فسق و فجور و شر و فریب و فساد
۱۳۰۱ھ

---

[1] کتاب سے مُراد نامۂ اعمال ہے۔ ۱۲

[2] مولوی قلندر علی مرحوم عالم تخلص کرتے تھے۔ ۱۲

ایضاً

عیاں شد چو عیدِ جلوسِ نظام
بسے خوشتر از عیدِ وصلِ حبیب
خرد فرقِ اعدا تراشیدہ گفت
کہ نصرٌ مّن اللہِ وفتحٌ قریب
۱۳۰۱ھ

تاریخ ولادت فرزند ارجمند در کاشانہ اقبال حضور نظام دام اقبالہٗ

شد چو خورشید شرف طالع بمشکوے نظام
قدسیاں گفتند شمع ملک و دولت آمدہ
مظہر اندر فکر تاریخ ولادت رفتہ بود
عقل گفت ایں لعل از کانِ شرافت آمدہ

تاریخ مدار المہامی نواب میر لائق علی خاں مرحوم و سرکار عالی

دوش کردم ز عقل چند سوال
کوست حلّالِ مشکلات و عُقد
گفتمش کے بود کہ شاہِ دکن
بنشیند بمسند اب و جد
گفت جشنِ جلوسِ فرخِ او
در ہزار ست و سی صد ست و اَحَد
گفتمش پس کہ باشدش دیواں؟
قرعہ بر لائق علی خاں زد
گفتمش سنگہا دریں راہ است
گفت زودا کہ حق بخواجہ رسد
گفتمش خواجہ کے شود دیواں؟
گفت "حق میرسد بمرکز خود"
۱۳۰۱ھ

تاریخ بنا و مرمّت مسجد مولٰنا حاجی ابراہیم حسین صاحب انصاری اثنا عشری پانی پتی دام ظلہم العالی

جعفری[1] مذہب بنا فرمود
بیتِ حق را کہ اعظم ست و قدیم
خبرش داد مُلہم **صادق**
کرد تعمیر کعبہ ابراہیم
۱۳۰۰ھ

---

[1] بانیٔ مسجد یعنی مولانا ابراہیم حسین صاحب کے والد کا نام اعظم علی اور اُن کے چچا کا نام جعفر علی اور دادا کا نام صادق علی تھا یہ تینوں نام اور خود بانی کا نام قطعہ تاریخ میں نہایت خوبی سے آیا ہے۔

شکریہ

دیوانِ حالی کا یہ نسخہ جناب مختار احمد صاحب بی اے، دہلوی استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی نے بڑی محنت اور توجہ سے تصحیح فرمایا، کاپیاں اور پروف بچوں کے ادیب جناب مُجیبی صاحب نے پڑھے۔ مولینا حالی کے ان دونو پرستاروں نے یہ خدمت کارِ ثواب سمجھ کر کی ہے، مگر ہم ان کے بہ دل شکر گزار ہیں (ایک آدھ جگہ تھوڑی بہت کسر پھر بھی رہ گئی) تاہم اُمید ہے کہ مروجہ نسخوں میں یہ نسخہ خدا چاہے سب سے صحیح نکلے گا۔ (ناشر)

(سیّد وصی اشرف چشتی مالک کتب خانہ علم و ادب دہلی نے علمی پریس دہلی میں چھپوا کر شائع کیا)

(کتبہ عبد القدیر مرصع رقم جلیسری)

طابع وناشر
علیمی پریس دھلی

کامیاب ہو رہی ہے۔ اس سے نہ صرف غیر ضروری خرچ میں کمی ہو رہی ہے بلکہ افراطِ زر کی روک تھام بھی ہو رہی ہے۔ ضروریاتِ زندگی کی قیمتوں پر ابھی تک کنٹرول ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ برطانیہ اس پالیسی پر بہت کامیابی سے عمل کر رہا ہے۔

503529
4-4-05

۸,۸۵۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر کی -

حصہ ۱۵,۳۴۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر کا تھا اور برطانیہ کا
۴,۸۲۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر کا - سنہ ۴۷ء میں اِن ممالک کی برآمد
کی ماہواری اوسط ۲,۴۰,۰۰,۰۰۰ ڈالر کی تھی اور
سنہ ۴۸ء میں ماہ اپریل تک یہ اوسط بڑھ کر ۲,۴۵۰,۰۰۰,۰۰۰ ڈالر
ہوگئی تھی -

اِس سال برطانیہ کی برآمد میں گذشتہ سال کے مقابلہ میں قابلِ قدر
اضافہ ہوا ہے - اِس سے برطانیہ کی دنیا کے ممالک میں دوسری

Sek– I
a N 170

Hali

6
8